وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ

اور اللہ نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو موت دیتا ہے اور کوئی تم میں سے پہنچ جاتا ہے بھتی عمر

الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝۷۰

کو تاکہ سمجھنے کے پیچھے اب کچھ نہ سمجھے ، اللہ خبردار ہے قدرت والا ۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اپنی حالت بھی سوچنے کے قابل ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو (اول) پیدا کیا پھر (عمر ختم ہونے پر) تمہاری جان قبض کرتا ہے (جن میں بعض تو ہوش و حواس میں چلتے ہاتھ پاؤں اٹھ جاتے ہیں) اور بعض تم میں وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں (جن میں نہ قوتِ جسمانیہ رہی نہ قوت عقلیہ رہے) جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے (جیسا کہ اکثر ایسے بوڑھوں کو دیکھا جاتا ہے کہ ابھی ان کو ایک بات بتلائی اور ابھی بھول گئے اور پھر اس کو پوچھ رہے ہیں) بے شک اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی قدرت والے ہیں (علم سے ہر ایک مصلحت جانتے ہیں، اور قدرت سے ویسا ہی کر دیتے ہیں، اس لئے حیات و وفات کی حالتیں مختلف کر دیں، پس یہ بھی دلیل ہے توحید کی)۔

معارف و مسائل

اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے پانی، نباتات، چوپایے اور شہد کی مکھی کے مختلف احوال بیان فرما کر انسان کو اپنی قدرت کاملہ اور مخلوق کے لئے اپنے انعامات پر متنبہ کیا، اب ان آیات سے اس کو اپنے اندرونی حالات پر غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ انسان کچھ نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو وجود کی دولت سے نوازا پھر جب چاہا موت بھیج کر وہ نعمت ختم کر دی، اور بعضوں کو تو موت سے پہلے ہی پیرانہ سالی کے ایسے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں کہ ان کے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں رہتے، ان کے ہاتھ پاؤں کی طاقت ختم ہو جاتی ہے، نہ وہ کوئی بات سمجھ سکتے ہیں، اور نہ سمجھی ہوئی یاد رکھ سکتے ہیں، یہ آفاقی اور انفسی تغیر و تبدل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ علم و قدرت اسی ذات کے خزانہ میں ہے جو خالق و مالک ہے۔

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ ، مَنْ يُّرَدُّ کے لفظ سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان پر پہلے بھی ایک ضعف اور کمزوری کا وقت گزر چکا ہے، یہ اس کے بچپن کا ابتدائی دور تھا جس

میں یہ کسی سوجھ بوجھ کا مالک نہ تھا، اس کے قویٰ بالکل ضعیف و ناتواں تھے، یہ اپنی بھوک پیاس کو دور کرنے اور اپنے اٹھنے بیٹھنے میں غیروں کا محتاج تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو جوانی عطا کی یہ اس کی ترقی کا زمانہ ہے، پھر رفتہ رفتہ اس کو بڑھاپے کے ایسے درجہ میں پہنچا دیتے ہیں جس میں یہ بالکل اسی طرح کمزوری، ضعف اور اضمحلال کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جیسا کہ بچپن میں تھا۔

اَرْذَلِ الْعُمُرِ، اس سے مراد پیرانہ سالی کی وہ عمر ہے جس میں انسان کے تمام جسمانی اور دماغی قویٰ مختل ہو جاتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس عمر سے پناہ مانگتے تھے، ارشاد ہے

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ سُوْۗءِ الْعُمُرِ وَفِيْ رِوَايَةٍ مِنْ اَنْ اُرَدَّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ،

"یعنی یا اللہ میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں بری عمر سے، اور ایک روایت میں ہے کہ پناہ مانگتا ہوں ارذل عمر سے"

ارذل العمر کی تعریف میں کوئی تعیین نہیں ہے، البتہ مذکورہ تعریف راجح معلوم ہوتی ہے، جس کی طرف قرآن نے بھی لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا سے اشارہ کیا ہے، کہ وہ ایسی عمر ہے جس میں ہوش و حواس باقی نہیں رہتے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام معلومات بھول جاتا ہے۔

ارذل العمر کی تعریف میں اور بھی اقوال ہیں، بعض نے اسّی سال کی عمر کو ارذل العمر قرار دیا ہے اور بعض نے نوّے سال کو، حضرت علیؓ سے بھی پچھتر سال کا قول منقول ہے، (صحیحین بحوالہ مظہری)

لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا، پیرانہ سالی کے انتہائی درجہ میں پہنچنے کے بعد آدمی میں نہ قوتِ جسمانیہ رہتی ہے اور نہ ہی عقلیہ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتا ہے، وہ تمام معلومات بھول کر بالکل کل کے بچے کی مانند ہو جاتا ہے، جس کو نہ علم و خبر ہے اور نہ ہی فہم و فراست، حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں کہ قرآن پڑھنے والے کی یہ حالت نہیں ہوگی۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ، بیشک اللہ تعالیٰ بڑے علم والے، بڑی قدرت والے ہیں۔ (علم سے ہر شخص کی عمر کو جانتے ہیں اور قدرت سے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، اگر چاہیں تو طاقت ور نوجوان پر ارذل العمر کے آثار طاری کر دیں، اور چاہیں تو سو سال کا معمّر انسان بھی طاقت ور جوان رہے، یہ سب کچھ اسی ذات کے دستِ قدرت میں ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ

اور اللہ نے بڑائی دی تم میں ایک کو ایک پر روزی میں ، سو جن کو

فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ

بڑائی دی وہ نہیں پہنچادیتے اپنی روزی ان کو جن کے مالک اُن کے ہاتھ ہیں کہ وہ سب

سَوَآءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۷۱﴾

اس میں برابر ہوجائیں، کیا اللہ کی نعمت کے منکر ہیں۔

خلاصۂ تفسیر

اور (اثباتِ توحید کے ساتھ شرک کی قباحت ایک باہمی معاملہ کے ضمن میں سنو کہ) اللہ تعالیٰ نے تم میں بعضوں کو بعضوں پر رزق (کے باب) میں فضیلت دی ہے (مثلاً کسی کو غنی اور غلاموں کا مالک بنایا کہ ان کے ہاتھ سے ان غلاموں کو بھی رزق پہنچتا ہے اور کسی کو غلام بنا دیا، کہ اس کو مالک ہی کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو نہ ایسا غنی بنایا کہ دوسرے غلاموں کو دے نہ غلام بنایا کہ اس کو کسی مالک کے ہاتھ سے پہنچے) سو جن لوگوں کو (رزق میں خاص) فضیلت دی گئی ہے (کہ ان کے پاس مال بھی ہو اور غلام بھی ہیں) وہ (لوگ) اپنے حصۂ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح کبھی دینے والے نہیں کہ وہ (مالک و مملوک) سب اس میں برابر ہوجائیں (کیونکہ اگر غلام رکھ کر دیا تو مال ان کی ملک ہی نہ ہوگا، بلکہ بدستور یہی مالک رہیں گے، اور اگر آزاد کرکے دیا تو مساوات ممکن ہی مگر وہ غلام نہ رہیں گے، پس غلامی اور مساوات ممکن نہیں، اسی طرح یہ بت وغیرہ جب باعترافِ مشرکین خدا تعالیٰ کے مملوک ہیں، تو باوجود مملوک ہونے کے معبودیت میں خدا کے مماثل کیسے ہوجائیں گے، اس میں شرک کی انتہائی تقبیح ہے کہ جب تمہارے غلام تمہارے شریکِ رزق نہیں ہوسکتے تو اللہ تعالیٰ کے غلام اس کے شریکِ الوہیت کیسے ہوسکتے ہیں) کیا (یہ مضامین سنکر) پھر بھی (خدائے تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس سے عقلاً یہ لازم آتا ہے کہ) خدا تعالیٰ کی نعمت کا (یعنی اس بات کا کہ خدا نے نعمت دی ہے) انکار کرتے ہیں؟

معارف و مسائل

اس سے پہلی آیات میں حق تعالیٰ نے اپنے علم و قدرت کے اہم مظاہر اور انسان پر مبذول ہونے والی نعمتوں کا تذکرہ فرما کر اپنی توحید کے فطری دلائل بیان فرمائے ہیں، جن کو دیکھ کر ادنیٰ سمجھ بوجھ والا آدمی بھی کسی مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ اس کی صفاتِ علم و قدرت وغیرہ میں شریک نہیں مان سکتا، اس آیت میں اسی مضمونِ توحید کو ایک باہمی معاملہ کی مثال سے واضح

کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے انسانی مصالح کے پیشِ نظر رزق میں سب انسانوں کو برابر نہیں کیا، بلکہ بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، اور مختلف درجات قائم فرمائے، کسی کو ایسا غنی بنا دیا جو ساز و سامان کا مالک ہی، جشم و خدم، غلام و خدمتگار رکھتا ہے، وہ خود بھی اپنی منشاء کے مطابق خرچ کرتا ہے، اور غلاموں، خدمتگاروں کو بھی اس کے ہاتھ سے رزق پہنچتا ہے، اور کسی کو غلام و خدمتگار بنا دیا کہ وہ دوسروں پر تو کیا خرچ کرتے ان کا اپنا خرچ بھی دوسروں کے ذریعہ پہنچتا ہے، اور کسی کو متوسط الحال بنایا، نہ اتنا غنی کہ دوسروں پر خرچ کرے، نہ اتنا فقیر و محتاج کہ اپنی ضروریات میں بھی دوسروں کا دست نگر ہو۔

اس قدرتی تقسیم کا یہ اثر سب کے مشاہدہ میں ہے کہ جس کو رزق میں فضیلت دی گئی اور غنی بنایا گیا وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنے مال کو اپنے غلاموں، خدمتگاروں میں اس طرح تقسیم کردے کہ وہ بھی مال میں اس کے برابر ہوجائیں۔

اس مثال سے سمجھو کہ جب مشرکین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بت اور دوسری مخلوقات جن کی وہ پرستش کرتے ہیں سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق و مملوک ہیں تو یہ کیسے تجویز کرتے ہیں کہ یہ مخلوق و مملوک اپنے خالق و مالک کے برابر ہوجائیں، کیا یہ لوگ یہ سب نشانیاں دیکھ کر اور یہ مضامین سنکر پھر بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک اور برابر قرار دیتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں، کیونکہ اگر یہ اقرار ہوتا کہ یہ سب نعمتیں صرف اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں ان میں کسی خود تراشیدہ بت کا یا کسی انسان اور جن کا کوئی دخل نہیں ہے تو پھر اُن چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر کیسے قرار دیتے؟

یہی مضمون سورۂ روم کی اس آیت میں بھی ارشاد ہوا ہے:

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ۭ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاۗءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ (سورۂ روم آیت ۲۸) "تمہارے لئے تمہاری ہی میں سے ایک مثال دی ہے، جو لوگ تمہارے زیر دست ہیں کیا وہ ہمارے دیئے ہوئے رزق میں تمہارے شریک ہیں کہ تم اس میں برابر ہوگئے ہو"

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ تم اپنے مملوک غلاموں اور خدمتگاروں کو اپنے برابر کرنا پسند نہیں کرتے تو اللہ کے لئے یہ کیسے پسند کرتے ہو کہ وہ اور اس کی مخلوق و مملوک چیزیں اس کے برابر ہوجائیں۔

معاش میں درجات کا اختلاف انسانوں کے لئے رحمت ہے

اس آیت میں واضح طور پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فقر و غنیٰ اور معیشت میں انسانوں کے مختلف درجات ہونا کہ کوئی غریب ہے کوئی امیر

کوئی متوسط الحال۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں، حق تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا ہے اور انسانی مصالح کا مقتضیٰ اور انسانوں کے لئے رحمت ہے، اگر یہ صورت نہ رہے اور مال وسامان میں سب انسان برابر ہو جائیں تو نظامِ عالم میں خلل اور فساد پیدا ہو جائے گا، اسی لئے جب سے دنیا آباد ہوئی کسی دور اور کسی زمانے میں سب انسان مال ومتاع کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوئے، اور نہ ہو سکتے ہیں، اور اگر کہیں زبردستی ایسی مساوات پیدا کر بھی دی جائے تو چند ہی روز میں تمام انسانی کاروبار میں خلل اور فساد کا مشاہدہ ہو جائے گا، حق تعالیٰ نے جیسے تمام انسانوں کو عقل ودماغ اور قوت وطاقت اور صلاحیتِ کار میں مختلف مزاجوں پر تقسیم کیا ہے، اور ان میں ادنیٰ، اعلیٰ، متوسط کی اقسام ہیں، جس کا کوئی صاحبِ عقل انکار نہیں کر سکتا، اسی طرح یہ بھی ناگزیر ہے کہ مال ومتاع میں بھی یہ مختلف درجات قائم ہوں کہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس کا صلہ پائے، اور اگر اہلِ صلاحیت اور نااہل کو برابر کر دیا گیا تو اہلِ صلاحیت کی حوصلہ شکنی ہوگی، جب معیشت میں اس کو نااہلوں کے برابر ہی رہنا ہے تو وہ کونسا داعیہ ہے جو اسے جد وجہد اور فکر وعمل پر مجبور کرے، اس کا لازمی نتیجہ صلاحیتِ کار کو برباد کرنا ہوگا۔

ارتکازِ دولت کے خلافِ قرآنی احکام

البتہ خالقِ کائنات نے جہاں عقلی اور جسمانی قوتوں میں بعض کو بعض پر فضیلت دی اور اس کے تابع رزق اور مال میں تفاوت قائم فرمایا، وہیں معاش کا یہ نظامِ محکم بھی قائم فرمایا کہ ایسا نہ ہونے پائے کہ دولت کے خزانوں اور کسبِ معاش کے مرکزوں پر چند افراد یا کوئی خاص جماعت قبضہ کر لے، دوسرے اہلِ صلاحیت کے کام کرنے کا میدان ہی باقی نہ رہے کہ وہ اپنی عقلی اور جسمانی صلاحیتوں سے کام لے کر معاش میں ترقی کر سکیں، اس کے لئے قرآن کریم سورۂ حشر میں ارشاد فرمایا: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ، "یعنی ہم نے تقسیمِ دولت کا قانون اس لئے بنایا کہ دولت صرف سرمایہ داروں میں منحصر ہو کر نہ رہ جائے"

آجکل دنیا کے معاشی نظاموں میں جو افراتفری پھیلی ہوئی ہے وہ اس ربانی قانونِ حکمت کو نظر انداز کرنے ہی کا نتیجہ ہے، ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں دولت کے مرکزوں پر سود وقمار کے راستہ سے چند افراد یا جماعتیں قابض ہو کر باقی ساری مخلوق کو اپنا معاشی غلام بنانے پر مجبور کر دیتی ہیں، ان کے لئے بجز غلامی اور مزدوری کے کوئی راستہ اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لئے نہیں رہ جاتا، وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود صنعت وتجارت کے میدان میں قدم نہیں رکھ سکتے۔

سرمایہ داروں کے اس ظلم وجور کے ردِّ عمل کے طور پر ایک متضاد نظام اشتراکیت کمیونزم یا سوشلزم کے نام سے وجود میں آتا ہے، جس کا نعرہ غریب وامیر کے تفاوت کو ختم کرنا اور سب

میں مساوات پیدا کرنا ہے، ظالمانہ سرمایہ داری کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے عوام اس نعرہ کے پیچھے لگ جاتے ہیں، مگر چند ہی روز میں وہ مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ یہ نعرہ محض فریب تھا، معاشی مساوات کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، اور غریب اپنی غربت اور فقر وفاقہ کے ساتھ بھی جو ایک انسانی احترام رکھتا تھا اپنی مرضی کا مالک تھا، یہ احترامِ انسانیت بھی ہاتھ سے جاتا رہا، نظامِ اشتراکیت میں انسان کی کوئی قدر قیمت مشین کے ایک پُرزے سے زائد نہیں، کسی جائداد کی ملکیت کا تو وہاں تصور ہی نہیں ہو سکتا، اور جو معاملہ وہاں ایک مزدور کے ساتھ کیا جاتا ہے اس پر غور کریں تو وہ کسی چیز کا مالک نہیں، اس کی اولاد اور بیوی بھی اس کی نہیں، بلکہ سب ریاست کی مشین کے کل پُرزے ہیں، جن کو مشین سے ٹوٹ ہوتے ہی اپنے کام پر لگ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں، ریاست کے مفروضہ مقاصد کے سوا نہ اس کا کوئی ضمیر ہے نہ آواز، ریاست کے جبر وتشدد اور ناقابلِ برداشت محنت سے کراہنا ایک بغاوت شمار ہوتا ہے، جس کی سزا موت ہے، خدا تعالیٰ اور مذہب کی مخالفت اور خالص مادہ پرستی نظامِ اشتراکیت کا بنیادی اصول ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جن سے کوئی اشتراکی انکار نہیں کر سکتا، ان کے پیشواؤں کی کتابیں اور اعمال نامے اس کے شاہد ہیں، کہ ان کے حوالوں کو جمع کرنا بھی ایک مستقل کتاب بنانے کے مترادف ہے۔

قرآن حکیم نے ظالمانہ سرمایہ داری اور احمقانہ اشتراکیت کی دونوں انتہاؤں کے درمیان افراط وتفریط سے پاک ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ رزق اور دولت میں فطری تفاوت کے باوجود کوئی فرد یا جماعت عامۂ مخلوق کو اپنا غلام نہ بنا سکے، اور مصنوعی گرانی اور قحط میں مبتلا نہ کر سکے، سود اور جوئے کو حرام قرار دے کر ناجائز سرمایہ داری کی بنیاد منہدم کر دی، پھر ہر مسلمان کے مال میں غریبوں کا حق متعین کر کے شریک کر دیا جو غریبوں پر احسان نہیں، بلکہ ادائی فرض ہے، آیت فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ اس پر شاہد ہے، پھر مرنے کے بعد مرنے والے کی تمام ملکیت کو افرادِ خاندان میں تقسیم کر کے ارتکازِ دولت کا خاتمہ کر دیا، قدرتی چشموں، سمندروں اور پہاڑی جنگلوں کی خودرو پیداوار کو تمام خلقِ خدا کا مشترک سرمایہ قرار دے دیا، جس پر کسی فرد یا جماعت کا قبضہ مالکانہ جائز نہیں، جب کہ سرمایہ داری نظام میں یہ سب چیزیں صرف سرمایہ داروں کی ملکیت قرار دیدی گئی ہیں۔

چونکہ علمی عملی صلاحیتوں کا متفاوت اور مختلف ہونا ایک امرِ فطری ہے، اور تحصیلِ معاش بھی انہی صلاحیتوں کے تابع ہے، اس لئے مال ودولت کی ملکیت کا متفاوت ہونا بھی عین تقاضائے حکمت ہے، جس کو دنیا کا کچھ بھی عقل وشعور ہے وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا اور مساوات کے نعرے لگانے والے بھی چند قدم چلنے کے بعد اس مساوات کے دعوے

کو چھوڑنے اور معیشت میں تفاوت و تفاضل پیدا کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خروشچف نے ۵ مئی ۱۹۶۰ء کو سپریم سویٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہم اجرتوں میں فرق مٹانے کی تحریک کے سختی سے مخالف ہیں، ہم اجرتوں میں مساوات قائم کرنے اور ان کے ایک سطح پر لانے کے کھلے بندوں مخالف ہیں، یہ لینن کی تعلیم ہے، اس کی تعلیم یہ تھی کہ سوشلسٹ سماج میں مادی محرکات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔"

(سویٹ ورلڈ، ص ۳۴۶)

معاشی مساوات کے خواب کی یہ تعبیر عدم مساوات تو ابتداء ہی سے سامنے آگئی تھی، مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ عدم مساوات اور امیر و غریب کا تفاوت اشتراکی مملکت روس میں عام سرمایہ دار ملکوں سے بھی آگے بڑھ گیا۔

لیون شیڈو لکھتا ہے:

"شاید ہی کوئی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک ایسا ہو جہاں مزدوروں کی اجرتوں میں اتنا تفاوت ہو جتنا روس میں ہے۔"

واقعات کی ان چند مثالوں نے آیت مذکورہ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ کی جبری تصدیق منکرین کی زبانوں سے کرادی وَاللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ، یہاں اس آیت کے تحت تو صرف اتنا ہی بیان کرنا تھا کہ رزق و مال میں تفاوت قدرتی اور فطری اور عین مصالح انسانی کے مطابق ہے، باقی تقسیم دولت کے اسلامی اصول اور سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اس کا امتیاز تو انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ زخرف پارہ نمبر ۲۵ آیت نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ کے تحت میں آئے گا، اور اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل رسالہ "اسلام کا نظام تقسیم دولت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس کا مطالعہ بھی کافی ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ

اور اللہ نے پیدا کیں تمہارے واسطے تمہاری ہی قسم سے عورتیں اور دیئے تم کو تمہاری

اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ

عورتوں سے بیٹے اور پوتے اور کھانے کو دیں تم کو ستھری چیزیں سو کیا جھوٹی

يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَيَعْبُدُوْنَ

باتیں مانتے ہیں اور اللہ کے فضل کو نہیں مانتے، اور پوجتے ہیں

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ کے سوائے ایسوں کو جو مختار نہیں ان کی روزی کے آسمان اور زمین سے

شَيْـــًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ

کچھ بھی اور نہ قدرت رکھتے ہیں، سو مت چسپاں کرو اللہ پر مثالیں، بیشک

اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا

اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے، اللہ نے بتلائی ایک مثال ایک بندہ

مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰی شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ

پرایا مال نہیں قدرت رکھتا کسی چیز پر اور ایک جس کو ہم نے روزی دی اپنی طرف سے خاصی روزی

يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ

وہ خرچ کرتا ہے اس میں سے چھپا کر اور سب کے روبرو، کہیں برابر ہوتے ہیں، سب تعریف اللہ کو ہے، پر

اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ

بہت لوگ نہیں جانتے، اور بتائی اللہ نے ایک دوسری مثال دو مرد ہیں

اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰی شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰی مَوْلٰىهُ ۙ

ایک گونگا کچھ کام نہیں کر سکتا، اور وہ بھاری ہے اپنے صاحب پر

اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ

جس طرف اس کو بھیجے نہ کر کے لائے کچھ بھلائی، کہیں برابر ہے وہ اور ایک وہ شخص جو حکم

بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾

کرتا ہے انصاف سے اور ہے سیدھی راہ پر۔

خلاصۂ تفسیر

اور (منجملہ دلائل قدرت و وجوہ نعمت کے ایک بڑی نعمت اور دلیل قدرت اللہ تعالیٰ کی خود تمہارا وجود و بقاء شخصی و نوعی ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم ہی میں سے (یعنی تمہاری جنس اور نوع سے) تمہارے لئے بیبیاں بنائیں اور (پھر) ان بیبیوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے

(ذکر یہ بقاء نوعی ہے) اور تم کو اچھی اچھی چیزیں کھانے (پینے) کو دیں (ذکر یہ بقاءِ شخصی ہوا اور چونکہ بقا موقوف ہے وجود پر اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا) کیا (یہ سب دلائل و نعم سنکر، پھر بھی بے بنیاد چیز پر (یعنی بتوں وغیرہ پر جن کے معبود ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ خلاف دلیل ہے) ایمان رکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری (بے قدری) کرتے رہیں گے، اور (مطلب اس ناشکری کا یہ ہے کہ) اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے رہیں گے جو ان کو نہ آسمان میں سے رزق پہنچانے کا اختیار رکھتی ہیں اور نہ زمین میں سے (یعنی نہ بارش برسانے کا ان کو اختیار ہے نہ زمین سے کچھ پیدا کرنے کا) اور نہ (اختیار حاصل کرنے کی) قدرت رکھتے ہیں (اس کی نفی سے زیادہ مبالغہ ہو گیا کیونکہ بعض دفعہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص بالفعل تو با اختیار نہیں ہے لیکن جد و جہد سے اختیارات حاصل کر لیتا ہے، اس لئے اس کی بھی نفی فرما دی) سو (جب شرک کا بطلان ثابت ہو گیا تو) تم اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں مت گھڑو (کہ اللہ تعالیٰ کی مثال بادشاہانِ دنیا کی سی ہے کہ ہر شخص ان سے عرض حاجت نہیں کر سکتا، اس لئے اس کے نائب ہوتے ہیں کہ عوام ان سے عرض حاجت کرتے ہیں، پھر وہ سلاطین سے عرض کرتے ہیں کذا فی الکبیر و یشعر من قولہ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا وَهٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ) اللہ تعالیٰ (خوب) جانتے ہیں (کہ ایسی مثالیں محض مہمل ہیں) اور تم (بوجہ عدم تدبر کے) نہیں جانتے (اس لئے جو چاہتے ہو بک ڈالتے ہو اور) اللہ تعالیٰ (شرک کے بطلان ظاہر کرنے کے لئے) ایک مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) ایک (تو) غلام ہے (کسی کا) مملوک کہ (اموال و تصرفات میں سے) کسی چیز کا (بلا اجازتِ آقا) اختیار نہیں رکھتا اور (دوسرا) ایک شخص ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دے رکھی تو اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (جس طرح چاہتا ہے جہاں چاہتا ہے) خرچ کرتا ہے (اس کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں) کیا اس قسم کے شخص آپس میں برابر ہو سکتے ہیں (بس جب مالکِ مجازی و مملوکِ مجازی برابر نہیں ہو سکتے، تو مالکِ حقیقی و مملوکِ حقیقی تو کب برابر ہو سکتے ہیں اور استحقاقِ عبادت موقوف ہے مساوات پر اور وہ ہے نہیں) ساری تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں (کیونکہ کامل الذات والصفات وہی ہیں، پس معبود بھی وہی ہو سکتا ہے، مگر پھر بھی مشرکین غیر اللہ کی عبادت نہیں چھوڑتے) بلکہ ان میں اکثر تو (بوجہ عدم تدبر کے) جانتے ہی نہیں (اور چونکہ عدم علم کا سبب خود ان کا عدم تدبر ہے اس لئے معذور نہ ہوں گے) اور اللہ تعالیٰ (اس کی توضیح کے لئے) ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں کہ (فرض کرو) دو شخص ہیں جن میں ایک تو (علاوہ غلام ہونے کے) گونگا (بہرا بھی) ہے (اور بوجہ بہرے اندھے بے عقل ہونے کے)

کوئی کام نہیں کر سکتا اور (اس وجہ سے) وہ اپنے مالک پر وبالِ جان ہے (کہ وہ مالک ہی اس کے سارے کام کرتا ہے اور) وہ (مالک) اس کو جہاں بھیجتا ہے کوئی کام درست کر کے نہیں لاتا، (یعنی خود تو کیا کرتا دوسروں کی تعلیم سے بھی اس سے کوئی کام درست نہیں ہوتا ہو) کیا یہ شخص اور ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں جو اچھی باتوں کی تعلیم کرتا ہو (جس سے اس کا ناطق، عاقل، صاحبِ قوتِ علمیہ ہونا معلوم ہوتا ہے) اور خود بھی (ہر امر میں) معتدل طریقہ پر (چلتا) ہو، (جس سے قوتِ عملیہ منتظمہ معلوم ہوتی ہے، جب مخلوق مخلوق میں باوجود اشتراکِ ماہیت و اشتراکِ اوصاف کے یہ تفاوت ہے تو کجا مخلوق و خالق، اور لا یقدر کے ترجمہ میں بلا اجازتِ آقا کی قید سے جو سابقہ آیات میں بعض شبہات مندفع ہو گئے، اور کوئی وسوسہ میں نہ پڑے کہ شاید معبود غیر اللہ کو بھی اذن ہو گیا ہو، جواب یہ ہے کہ ربوبیت کے لئے کسی کو اذن نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے)۔

معارف و مسائل

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا، اس آیت میں ایک اہم نعمت کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہی جنس اور قوم میں سے تمہاری بیبیاں بنائیں، تاکہ باہمی موانست بھی پوری ہو اور نسلِ انسانی کی شرافت و بزرگی بھی قائم رہے۔

دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیبیاں تمہاری ہی جنس کی ہیں، انکی ضروریات اور جذبات بھی تمہارے ہی جیسے ہیں، ان کی رعایت تم پر لازم ہے۔

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً، یعنی تمہاری بیبیوں سے ہم نے تمہارے بیٹے پوتے پیدا کئے"۔

یہاں یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اولاد تو ماں باپ دونوں ہی سے مل کر پیدا ہوتی ہے، اس آیت میں اس کو صرف ماؤں سے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ بچہ کی تولید و تخلیق میں بہ نسبت باپ کے ماں کا دخل زیادہ ہے، باپ سے تو صرف ایک قطرۂ بے جان نکلتا ہے اس قطرہ پر مختلف قسم کے دور گزرتے ہوئے انسانی شکل میں تبدیل ہونا اور اس میں جان پڑنا قدرت کے ان سارے تخلیقی کارناموں کا محل تو ماں کا پیٹ ہی ہے، اسی لئے حدیث میں ماں کے حق کو باپ کے حق پر مقدم رکھا گیا ہے۔

اس جملے میں بیٹوں کے ساتھ پوتوں کا ذکر فرمانے میں اس طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ اس جوڑے بنانے کا اصل مقصد نسلِ انسانی کی بقاء ہے کہ اولاد پھر اولاد کی اولاد ہوتی رہے، تو یہ انسان کی بقاءِ نوعی کا سامان ہوا۔

پھر وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ میں اس کی بقاءِ شخصی کے سامان کا ذکر فرمادیا کہ انسان پیدا ہو جائے تو پھر اس کی بقاءِ شخصی کے لئے غذاء کی ضرورت ہے، وہ بھی حق تعالیٰ نے مہیا فرمادی، آیت میں لفظ حَفَدَة کے اصلی معنی مددگار اور خدمت گار کے ہیں، اولاد کے لئے یہ لفظ استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اولاد کو اپنے ماں باپ کا خادم ہونا چاہئے (قرطبی)

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ میں ایک اہم حقیقت کو واضح فرمایا ہے، جس سے غفلت برتنا ہی تمام کافرانہ شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے، وہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ حق تعالیٰ کو اپنے بنی نوع انسان پر قیاس کر کے ان میں سے اعلیٰ ترین انسان مثلاً بادشاہ و فرمانروا کو اللہ تعالیٰ کی مثال قرار دیتے ہیں، اور پھر اس غلط بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے نظامِ قدرت کو بھی انسانی بادشاہوں کے نظام پر قیاس کر کے یہ کہنے لگتے ہیں کہ جس طرح کسی سلطنت و حکومت میں اکیلا بادشاہ سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا بلکہ اپنے ماتحت وزراء اور دوسرے افسروں کو اختیارات سپرد کر کے ان کے ذریعہ نظمِ مملکت چلایا جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی ہونا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کے ماتحت کچھ اور معبود بھی ہوں جو اللہ کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائیں، یہی تمام بت پرست اور مشرکین کا عام نظریہ ہے، اس جملے نے ان کے شبہات کی جڑ قطع کر دی، کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مخلوق کی مثالیں پیش کرنا خود بے عقلی ہے، وہ مثال و تمثیل اور ہمارے وہم و گمان سے بالاتر ہے۔

آخری دو آیتوں میں انسان کی جو دو مثالیں دی گئی ہیں، ان میں سے پہلی مثال میں تو آقا اور غلام یعنی مالک اور مملوک کی مثال دے کر بتلایا کہ جب یہ دونوں ایک ہی جنس، ایک ہی نوع کے ہوتے ہوئے آپس میں برابر نہیں ہو سکتے تو کسی مخلوق کو خدا تعالیٰ کے ساتھ کیسے برابر ٹھہراتے ہو۔

اور دوسری مثال میں ایک طرف ایک انسان ہے، جو لوگوں کو عدل و انصاف اور اچھی باتیں سکھاتا ہے، جو اس کی قوتِ علمیہ کا کمال ہے، اور خود بھی معتدل اور سیدھے راستہ پر چلتا ہے، جو اس کی قوتِ عملیہ کا کمال ہے، اس علمی اور عملی قوت میں مکمل انسان کے بالمقابل وہ انسان ہے جو نہ خود اپنا کام کر سکتا ہے نہ کسی دوسرے کا کوئی کام درست کر سکتا ہے، یہ دونوں قسم کے انسان ایک ہی جنس ایک ہی نوع ایک ہی برادری کے ہونے کے باوجود آپس میں برابر نہیں ہو سکتے، تو خالق و مالکِ کائنات جو حکیم مطلق اور قادرِ مطلق اور علیم و خبیر ہے اس کے ساتھ کوئی مخلوق کیسے برابر ہو سکتی ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ
اور اللہ ہی کے پاس ہیں بھید آسمانوں اور زمین کے اور قیامت کا کام تو ایسا ہے جیسے لپک
الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۷۷ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ
نگاہ کی یا اس سے بھی قریب اللہ ہر چیز پر قادر ہے ، اور اللہ نے تم کو نکالا
مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ
تمہاری ماں کے پیٹ سے نہ جانتے تھے تم کسی چیز کو اور دیئے تم کو کان اور
الْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۷۸ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى
آنکھیں اور دل ، تاکہ تم احسان مانو ، کیا نہیں دیکھے
الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَاۗءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ
اڑتے جانور حکم کے باندھے ہوئے آسمان کی ہوا میں کوئی نہیں تھامے رہا ان کو سوا اللہ کے اس میں
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۷۹ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ
نشانیاں ہیں اُن لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں ، اور اللہ نے بنا دیئے تم کو تمہارے گھر
سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ
بسنے کی جگہ اور بنا دیئے تم کو چوپاؤں کی کھال سے ڈیرے جو ہلکے رہتے ہیں تم پر جس دن
ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ
سفر میں ہو اور جس دن گھر میں ہو ، اور بھیڑوں کی اُون سے اور اونٹوں کی بربریوں سے اور بکریوں کی بالوں
اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝۸۰ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا
سے کتنے اسباب استعمال کی چیزیں وقت مقرر تک ، اور اللہ نے بنا دیئے تمہارے واسطے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے سائے
وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ
اور بنا دیں تمہارے واسطے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں اور بنا دیئے تم کو کرتے جو بچاؤ ہیں
الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ
گرمی میں اور کرتے جو بچاؤ ہیں لڑائی میں ، اسی طرح پورا کرتا ہے اپنا احسان تم پر

لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿٨١﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٨٢﴾ يَعْرِفُوْنَ

تاکہ تم حکم مانو ، پھر اگر پھر جائیں تو تیرا کام تو یہی ہے کھول کر سنا دینا ، پہچانتے ہیں

نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٨٣﴾

اللہ کا احسان پھر منکر ہو جاتے ہیں اور بہت ان میں ناشکر ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

اور آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں (جو کسی کو معلوم نہیں باعتبار علم کے اللہ ہی کے ساتھ خاص ہیں (تو صفتِ علم میں وہ کامل ہیں) اور (قدرت میں ایسے کامل ہیں کہ ان غیوب میں سے جو ایک امر عظیم ہے یعنی) قیامت (اس) کا معاملہ بس ایسا (جھٹ پٹ) ہو گا جیسے آنکھ جھپکنا، بلکہ اس سے بھی جلدی (قیامت کے معاملہ سے مراد ہے ۔ مُردوں میں جان پڑنا اور اس کا بہ نسبت آنکھ جھپکنے کے جلدی ہونا ظاہر ہے، کیونکہ آنکھ جھپکنا حرکت ہے اور حرکت زمانی ہوتی ہے، اور جان پڑنا آنی ہے، اور آنی ظاہر ہے کہ زمانی سے اسرع ہے، اور اس پر تعجب نہ کیا جائے کیونکہ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (اور اثباتِ قدرت کے لئے تخصیص قیامت کی شاید اس وجہ سے کی ہو کہ وہ منجملہ غیوب خاصہ کے بھی ہے، اس لئے وہ علم اور قدرت دونوں کی دلیل ہے، قبل الوقوع تو علم اور بعد الوقوع قدرت کی) اور (منجملہ دلائل قدرت و وجوہ نعمت یہ امر ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے (اس درجہ کا نام فلاسفہ کی اصطلاح میں عقلِ ہیولانی ہے) اور اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھ اور دل تاکہ تم شکر کرو (استدلال علی القدرت کے لئے) کیا لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کے (تلے) فضاء میں (قدرت کے) مسخر ہو رہے ہیں (یعنی) انکو (اس جگہ) کوئی نہیں تھامتا بجز اللہ کے (ورنہ ان کے اجسام کا ثقیل ہونا اور مادۂ ہوا کا رقیق و لطیف ہونا طبعاً مقتضی اس کو ہے کہ نیچے گر پڑیں، اس لئے اس امر مذکور میں) ایمان والوں کے لئے (قدرتِ الٰہیہ کی) چند دلیلیں (موجود) ہیں (چند نشانیاں اس لئے فرمایا کہ پرندوں کو خاص وضع پر پیدا کرنا جس سے اُڑنا ممکن ہو ایک دلیل ہے، پھر فضاء کو ایسے طرز پر پیدا کرنا جس میں اُڑنا ممکن ہو دوسری دلیل ہے، پھر بالفعل اس طیران کا وقوع تیسری دلیل ہے اور جن اسباب کو طیران میں دخل ہے وہ سب اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، پھر ان اسباب پر مسبّب یعنی طیران کا مرتب ہو جانا یہ بھی مشیتِ الٰہی ہے، ورنہ اکثر ایسا بھی

ہوتا ہے کہ کسی چیز کے اسباب موجود ہوتے ہوئے بھی وہ وجود میں نہیں آتی، اس لئے مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا فرمایا گیا، اور منجملہ وجوہ نعمت و دلائل قدرت یہ امر ہے کہ، اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے (حالتِ حضر میں) تمہارے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی (اور حالتِ سفر میں) تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھر (یعنی خیمے) بنائے جن کو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام (کرنے) کے دن ہلکا (پھلکا) پاتے ہو (اور اس وجہ سے اس کا لادنا اور نصب کرنا سب سہل معلوم ہوتا ہے) اور ان (جانوروں) کے اُون اور انکے رُوؤں اور ان کے بالوں سے (تمہارے) گھر کا سامان اور فائدے کی چیزیں ایک مدت تک کے لئے بنائیں (مدت تک اس لئے فرمایا کہ عادۃً یہ سامان بہ نسبت رُوئی کے کپڑوں کے دیرپا ہوتا ہے، اور منجملہ دلائل قدرت و وجوہ نعمت کے ایک یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اپنی بعض مخلوقات کے سائے بنائے (جیسے درخت و مکانات وغیرہ) اور تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ کی جگہیں بنائیں (یعنی غار وغیرہ جس میں گرمی سردی، بارش، موذی دشمن جانور و آدمی سے محفوظ رہ سکتے ہو) اور تمہارے لئے ایسے کُرتے بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کریں اور ایسے کرتے (بھی) بنائے جو تمہاری آپس کی لڑائی (میں زخم لگنے) سے تمہاری حفاظت کریں (مراد اس سے زرہیں ہیں) اللہ تعالیٰ تم پر اسی طرح کی اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے کہ تم (ان نعمتوں کے شکریہ میں) فرمانبردار رہو، (اور ہر چند کہ مذکورہ نعمتوں میں بعض مصنوعاتِ عباد بھی ہیں، مگر ان کا مادّہ اور ان کے بنانے کا سلیقہ تو اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، اس لئے منعم حقیقی وہی ہیں پھر ان نعمتوں کے بعد بھی) اگر یہ لوگ ایمان سے اعراض کریں (تو آپ غم نہ کریں آپ کا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) آپ کے ذمہ تو صرف صاف صاف پہنچا دینا ہے (اور ان کے اعراض کی وجہ یہ نہیں کہ وہ ان نعمتوں کو پہچانتے نہیں، بلکہ وہ لوگ) خدا کی نعمتوں کو تو پہچانتے ہیں مگر پہچان کر پھر (برتاؤ میں) اس کے منکر ہوتے ہیں (کہ جو برتاؤ منعم کے ساتھ چاہئے تھا یعنی عبادت و طاعت وہ دوسرے کے ساتھ کرتے ہیں) اور زیادہ ان میں ایسے ہی ناشکرے ہیں ؛

معارف و مسائل

قولہ تعالیٰ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا، اس میں اشارہ ہے کہ علم انسان کا ذاتی ہنر نہیں، پیدائش کے وقت وہ کوئی علم و ہنر نہیں رکھتا، پھر ضرورتِ انسانی کے مطابق اس کو کچھ کچھ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ سکھایا جاتا ہے، جس میں نہ ماں باپ کا دخل ہے نہ کسی معلّم کا، سب سے پہلے اس کو رونا سکھایا، اس کی یہی صفت اس وقت اس کی تمام ضروریات مہیا کرتی ہے، بھوک پیاس لگے تو وہ روتا ہے، سردی گرمی لگے تو رو دیتا ہے، کوئی اور تکلیف

پہونچے تو رو دیتا ہے، قدرت نے اس کی ضروریات کے لئے ماں باپ کے دلوں میں خاص اُلفت ڈال دی کہ جب بچے کی آواز سنیں تو وہ اس کی تکلیف کے پہچاننے اور اس کے دور کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، اگر بچے کو منجانب اللہ یہ رونے کی تعلیم نہ دی جاتی تو اس کو کون یہ کام سکھا سکتا کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے تو اس طرح چلایا کرے، اس کے ساتھ ہی اس کو اللہ تعالیٰ نے الہامی طور پر یہ بھی سکھا دیا کہ اپنی غذا کو ماں کی چھاتی سے حاصل کرنے کے لئے اپنے مسوڑھوں اور ہونٹوں سے کام لے، اگر یہ تعلیم فطری اور بلا واسطہ نہ ہوتی تو کس معلم کی مجال تھی جو اس نومولود کو منہ چلانا اور چھاتی کو چوسنا سکھا دیتا، اسی طرح جوں جوں اس کی ضروریات بڑھتی گئیں قدرت نے اس کو بلا واسطہ ماں باپ کے خود بخود سکھا دیا، کچھ عرصہ کے بعد اس میں یہ سلیقہ پیدا ہونے لگتا ہے کہ ماں باپ اور دوسرے آس پاس کے آدمیوں کی بات سن کر یا کچھ چیزوں کو دیکھ کر کچھ سیکھنے لگتا ہے، اور پھر اُن سنی ہوئی آوازوں اور دیکھی ہوئی چیزوں کو سوچنے سمجھنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا کے بعد فرمایا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ، یعنی اگرچہ ابتداءِ پیدائش میں انسان کو کسی چیز کا علم نہیں تھا، مگر قدرت نے اس کے وجود میں علم حاصل کرنے کے عجیب و غریب قسم کے آلات نصب کر دیئے تھے، ان آلات میں سب سے پہلے سمع یعنی سننے کی قوت کا ذکر فرمایا جس کی تقدیم کی وجہ شاید یہ ہو کہ انسان کا سب سے پہلا علم اور سب سے زیادہ علم کانوں ہی کے رستہ سے آتا ہے، شروع میں آنکھ تو بند ہوتی ہے مگر کان سنتے ہیں، اور اس کے بعد بھی اگر غور کیا جائے تو انسان کو اپنی پوری عمر میں جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں ان میں سب سے زیادہ کانوں سے سنی ہوئی ہوتی ہیں، آنکھ سے دیکھی ہوئی معلومات اس کی نسبت سے بہت کم ہوتی ہیں۔

ان دونوں کے بعد نمبر اُن معلومات کا ہے جن کو انسان اپنی سنی اور دیکھی ہوئی چیزوں میں غور و فکر کر کے معلوم کرتا ہے، اور یہ کام قرآنی ارشادات کے مطابق انسان کے قلب کا ہے، اس لئے تیسرے نمبر میں اَفْـِٕدَة فرمایا، جو فُؤاد کی جمع ہے، جس کے معنی قلب کے ہیں، فلاسفہ نے عام طور پر سمجھ بوجھ اور ادراک کا مرکز انسان کے دماغ کو قرار دیا ہے، مگر ارشاد قرآنی سے معلوم ہوا کہ دماغ کو اگرچہ اس ادراک میں دخل ضرور ہے، مگر علم و ادراک کا اصلی مرکز قلب ہے۔

اس موقع پر حق تعالیٰ نے سننے، دیکھنے، اور سمجھنے کی قوتوں کا ذکر فرمایا ہے، گویائی اور زبان کا ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ نطق اور گویائی کو حصولِ علم میں دخل نہیں، بلکہ وہ اظہارِ علم کا ذریعہ ہیں، اس کے علاوہ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ لفظ سمع کے ساتھ نطق بھی ضمناً آگیا، کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص سنتا ہے وہ بولتا بھی ہے، گونگا جو بولنے پر قادر نہیں وہ کانوں سے بھی بہرا ہوتا ہے، اور

شاید اس کے نہ بولنے کا سبب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی آواز سنتا نہیں، جس کو سن کر بولنا سیکھے، واللہ اعلم

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا، بیوت، بیت کی جمع ہے، جس مکان میں رات گذاری جائے اس کو بیت کہتے ہیں، امام قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں فرمایا:

كُلُّ مَا عَلَاكَ فَاَظَلَّكَ فَهُوَ سَقْفٌ وَّسَمَاءٌ، وَكُلُّ مَا اَقَلَّكَ فَهُوَ اَرْضٌ وَكُلُّ مَا سَتَرَكَ مِنْ جِهَاتِكَ الْاَرْبَعِ فَهُوَ جِدَارٌ فَاِذَا انْتَظَمَتْ وَاتَّصَلَتْ فَهُوَ بَيْتٌ،

"جو چیز تمہارے سر سے بلند ہو اور تم پر سایہ کرے وہ چھت یا سماء کہلاتی ہے، اور جو چیز تمہارے وجود کو اپنے اوپر اٹھائے وہ زمین ہے، اور جو چیز چاروں طرف سے تمہارا پردہ کرے وہ دیواریں ہیں اور جب یہ سب چیزیں جمع ہو جائیں تو وہ بیت ہے"

گھر بنانے کا اصل مقصد قلب جسم کا سکون ہے

اس میں حق تعالیٰ نے انسان کے بیت یعنی گھر کو مسکن فرما کر گھر بنانے کا فلسفہ اور حکمت واضح فرما دی، کہ اس کا اصل مقصد جسم اور قلب کا سکون ہے، عادۃً انسان کا کسب و عمل گھر سے باہر ہوتا ہے، جو اس کی حرکت سے وجود میں آتا ہے، اس کے گھر کا اصلی منشاء یہ ہے کہ جب حرکت و عمل سے تھک جائے تو اس میں جا کر آرام کرے، اور سکون حاصل کرے اگرچہ بعض اوقات انسان اپنے گھر میں بھی حرکت و عمل میں مشغول رہتا ہے مگر یہ عادۃً کم ہے۔

اس کے علاوہ سکون اصل میں قلب و دماغ کا سکون ہے، وہ انسان کو اپنے گھر میں ہی حاصل ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انسان کے مکان کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ اس میں سکون ملے، آج کی دنیا میں تعمیرات کا سلسلہ اپنے عروج پر ہے، اور ان میں ظاہری ٹیپ ٹاپ پر بے حد خرچ بھی کیا جاتا ہے، لیکن ان میں ایسے مکانات بہت کم ہیں جن میں قلب اور جسم کا سکون حاصل ہو، بعض اوقات تو مصنوعی تکلفات خود ہی آرام و سکون کو برباد کر دیتے ہیں، اور وہ بھی نہ ہو تو گھر میں جن لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ اس سکون کو ختم کر دیتے ہیں، ایسے عالی شان مکانات سے وہ جھگی اور جھونپڑی اچھی ہے جس کے رہنے والے کے قلب و جسم کو سکون حاصل رہا ہو۔

قرآن کریم ہر چیز کی رُوح اور اصل کو بیان کرتا ہے، انسان کے گھر کا اصل مقصد اور سب سے بڑی غرض و غایت سکون کو قرار دیا، اسی طرح ازدواجی زندگی کا اصل مقصد بھی سکون قرار دیا، لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا، جس ازدواجی زندگی سے یہ مقصد حاصل نہ ہو وہ اس کے اصل فائدے سے محروم ہے، آج کی دنیا میں ان چیزوں میں رسمی اور غیر رسمی تکلفات اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کی حد نہیں رہی، اور مغربی تمدن و معاشرت نے ان چیزوں میں ظاہری زیب و زینت کے سارے سامان جمع کر دیئے، مگر سکونِ قلب و جسم سے قطعاً محروم کر ڈالا۔

قولہ مِنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ وقولہ مِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا سے ثابت ہوا کہ جانوروں کی کھال اور بال اور اُون سب کا استعمال انسان کے لئے حلال ہے، اس میں یہ بھی قید نہیں کہ جانور مذبوح ہو یا مردار اور نہ یہ قید ہے کہ اس کا گوشت حلال ہے یا حرام، ان سب قسم کے جانوروں کی کھال دباغت دے کر استعمال کرنا حلال ہے، اور بال اور اُون پر تو جانور کی موت کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا، وہ بغیر کسی خاص صنعت کے حلال اور جائز ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے، البتہ خنزیر کی کھال اور اس کے تمام اجزاء ہر حال میں نجس اور ناقابلِ انتفاع ہیں۔

سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ، یہاں انسان کو کرتے کی غرض گرمی سے بچانے کو فرمایا ہے، حالانکہ کرتہ انسان کو گرمی اور سردی دونوں سے بچاتا ہے، اس کا ایک جواب تو امام قرطبیؒ اور دوسرے مفسرین نے یہ دیا ہے کہ قرآن حکیم عربی زبان میں آیا ہے، اس کے اوّلین مخاطب عرب ہیں، اس لئے اس میں عرب کی عادات و ضروریات کا لحاظ رکھ کر کلام کیا گیا ہے، عرب ایک گرم ملک ہے، وہاں برف باری اور سردی کا تصور ہی مشکل ہے، اس لئے گرمی سے بچانے کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا، حضرت تھانویؒ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ قرآن کریم نے اسی سورۃ کے شروع میں تکم فِيْهَا دِفْءٌ فرما کر لباس کے ذریعہ سردی سے بچنے اور گرمی حاصل کرنے کا ذکر پہلے کر دیا تھا، اس لئے یہاں صرف گرمی دفع کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور جس دن کھڑا کریں گے ہم ہر فرقہ میں ایک بتلانیوالا پھر حکم نہ ملے منکروں کو

وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ

اور نہ اُن سے توبہ لی جائے، اور جب دیکھیں گے ظالم عذاب کو پھر

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ

ہلکا نہ ہوگا اُن سے اور نہ اُن کو ڈھیل ملے، اور جب دیکھیں

اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ

مشرک اپنے شریکوں کو بولیں اے رب یہ ہمارے شریک ہیں جن کو

كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾

ہم پکارتے تھے تیرے سوا تب وہ اُن پر ڈالیں گے بات کہ تم جھوٹے ہو،

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِالسَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور آپڑیں اللہ کے آگے اس دن عاجز ہو کر اور بھول جائیں جو جھوٹ باندھتے تھے،

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ

جو لوگ منکر ہوئے ہیں اور روکتے رہے ہیں اللہ کی راہ سے ان کو ہم بڑھا دیں گے عذاب پر

الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ

عذاب بدلہ اس کا جو شرارت کرتے تھے، اور جس دن کھڑا کریں گے ہم ہر فرقہ میں

شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ

ایک بتلانے والا ان پر انہی میں کا اور تجھ کو لائیں بتلانے کو ان لوگوں پر،

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً

اور اتاری ہم نے تجھ پر کتاب کھلا بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت

وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور خوش خبری حکم ماننے والوں کے لئے۔

خلاصۂ تفسیر

اور (وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے) جس دن ہم ہر امت میں سے ایک ایک گواہ (کہ اس امت کا پیغمبر ہوگا) قائم کریں گے (جو ان کے اعمالِ سیئہ کی شہادت دیں گے) پھر ان کافروں کو (عذر و معذرت کرنے کی) اجازت نہ دی جائے گی اور نہ ان سے حق تعالیٰ کے راضی کرنے کی فرمائش کی جائے گی (یعنی ان سے یوں نہ کہا جائے گا کہ تم توبہ یا کوئی عمل کر کے اللہ کو خوش کر لو، وجہ اس کی ظاہر ہے، کہ آخرت دارالجزا ہے دارالعمل نہیں) اور جب ظالم (یعنی کافر) لوگ عذاب کو دیکھیں گے (یعنی اس میں پڑیں گے) تو وہ عذاب نہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ وہ (اس میں) کچھ مہلت دیئے جائیں گے (کہ چند روز کے بعد وہ عذاب جاری کیا جائے) اور جب مشرک لوگ اپنے شریکوں کو (جن کو خدا کے سوا پوجتے تھے) دیکھیں گے تو (بطور اقرار جرم کے) کہیں گے کہ

اے ہمارے پروردگار! وہ ہمارے شریک یہی ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم ان کو پوجا کرتے تھے سو وہ (شرکاء ڈریں گے کہ کہیں ہماری کم بختی نہ آجائے اس لئے) وہ ان کی طرف کلام کو متوجہ کریں گے کہ تم جھوٹے ہو (اصل مطلب ان کا یہ ہوگا کہ ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں جس سے مقصود اپنی حفاظت ہے) اب خواہ یہ مطلب ان کا صحیح ہو جیسا اگر مقبولین مثل ملائکہ وانبیاء علیہم السلام کے یہ بات کہیں تو صحیح ہے، کقولہ تعالیٰ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اور خواہ یہ غلط ہو جیسے خود شیاطین کہنے لگیں، اور خواہ ان کو صحیح غلط ہونے کی خبر ہی نہ ہو، جیسے اصنام واشجار وغیرہ کہنے لگیں) اور یہ مشرک اور کافر لوگ اس روز اللہ کے سامنے اطاعت کی باتیں کرنے لگیں گے اور جو کچھ (دنیا میں) افتراء پردازیاں کرتے تھے (اس وقت) وہ سب گم ہو جائیں گے (اور ان میں) جو لوگ (خود بھی) کفر کرتے تھے (اور دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ (یعنی دین) سے روکتے تھے اُن کے لئے ہم ایک سزا پر (کہ کفر کے مقابلہ میں ہوگی) دوسری سزا بمقابلہ ان کے فساد کے (کہ راہِ خدا سے روکتے تھے) بڑھا دیں گے۔

اور (وہ دن بھی یاد کرنے اور لوگوں کے ڈرنے کا ہے) جس دن ہم ہر امت کے ایک ایک گواہ جو انہی میں کا ہوگا ان کے مقابلہ میں قائم کریں گے (مراد اس امت کا نبی ہے اور انہی میں کا ہونا عام ہے خواہ باعتبار شرکت نسب کے ہو خواہ باعتبار شرکت سکنیٰ کے ہو) اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے (اور اس اخبارِ شہادت سے جو آپ کی رسالت کا اخبار مفہوم ہوتا ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ) ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے جو (علاوہ معجز ہونے کے جو کہ مدار ہے اثباتِ رسالت کا اُن خوبیوں کا جامع ہے) کہ تمام (دین کی) باتوں کا (بواسطہ یا بلا واسطہ عامۃ الناس کے لئے) بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور (ایمان پر) خوشخبری سنانے والا ہے۔

معارف ومسائل

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔ اس میں کتاب یعنی قرآن کو ہر چیز کا بیان فرمایا گیا ہے، مراد اس سے دین کی سب چیزیں اور باتیں ہیں، کیونکہ وحی ونبوت کا مقصد انہی چیزوں سے متعلق ہے، اس لئے معاشی فنون اور ان کے مسائل کو قرآن میں ڈھونڈھنا ہی غلط ہے، اگر کہیں کوئی ضمنی اشارہ آجائے تو وہ اس کے منافی نہیں، رہا یہ سوال کہ قرآن کریم میں دین کے بھی تو سب مسائل مذکور نہیں تو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کہنا کیسے درست ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم میں اصول تو تمام مسائل کے موجود ہیں، انہی کی روشنی میں احادیث رسول اللہ ان مسائل کا بیان کرتی ہیں، اور کچھ تفصیلات کو اجماع وقیاس شرعی

کے سپرد کر دیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع وقیاس سے جو مسائل نکلے ہیں وہ بھی ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کئے ہوئے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى

اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کے دینے کا اور منع کرتا

عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝٩٠

بے حیائی سے اور نامعقول کام سے اور سرکشی سے اور تم کو سمجھاتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔

خلاصۂ تفسیر

بیشک اللہ تعالیٰ (قرآن میں) اعتدال اور احسان اور اہلِ قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور (کسی پر) ظلم (اور زیادتی) کرنے سے منع فرماتے ہیں (اور مامورات ومنہیات مذکورہ میں تمام اعمال صالحہ اور سیئہ آگئے، اس جامعیت کی وجہ سے قرآن کا تبیان ہونا صاف ظاہر ہے اور) اللہ تعالیٰ تم کو (امور مذکورہ کی) اس لئے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو (اور عمل کرو، کیونکہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہونا اسی پر موقوف ہے)۔

معارف ومسائل

یہ آیت قرآن کریم کی جامع ترین آیت ہے، جس میں پوری اسلامی تعلیمات کو چند الفاظ میں سمو دیا گیا ہے، اسی لئے سلفِ صالحین کے عہد مبارک سے آج تک دستور چلا آرہا ہے کہ جمعہ وعیدین کے خطبوں کے آخر میں یہ آیت تلاوت کی جاتی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی جامع ترین آیت سورۂ نحل میں یہ ہے، اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ الخ (ابن کثیر)

اور حضرت اکثم بن صیفی رضؓ تو اسی آیت کی بناء پر اسلام میں داخل ہوئے، امام ابن کثیر نے حافظ حدیث ابو یعلی کی کتاب معرفۃ الصحابہ میں سند کے ساتھ یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ اکثم بن صیفی اپنی قوم کے سردار تھے، جب اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت اور اشاعتِ اسلام کی خبر ملی تو ارادہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں، مگر قوم کے لوگوں نے کہا کہ آپ ہم سب کے بڑے ہیں، آپ کا خود جانا مناسب نہیں، اکثمؓ نے کہا کہ اچھا تو قبیلہ کے دو آدمی منتخب کر دو جو وہاں جائیں، اور حالات کا جائزہ لے کر مجھے بتلائیں، یہ دونوں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اکثم بن صیفی کی طرف سے دو باتیں دریافت کرنے کے لئے آئے ہیں، اکثم کے دو سوال یہ ہیں:

مَنْ اَنْتَ وَمَا اَنْتَ، | آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟

آپ نے ارشاد فرمایا کہ پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ میں محمد بن عبداللہ ہوں اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، اس کے بعد آپ نے سورۃ نحل کی یہ آیت تلاوت فرمائی، اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الآیۃ ان دونوں قاصدوں نے درخواست کی کہ یہ جملے ہمیں پھر سنایئے، آپ اس آیت کی تلاوت کرتے رہے یہانتک کہ ان قاصدوں کو آیت یاد ہوگئی

قاصد واپس اکثم بن صیفی کے پاس آئے اور بتلایا کہ ہم نے پہلے سوال میں یہ چاہا تھا کہ آپ کا نسب معلوم کریں، مگر آپ نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی صرف باپ کا نام بیان کر دینے پر اکتفا کیا، مگر جب ہم نے دوسروں سے آپ کے نسب کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ بڑے عالی نسب شریف ہیں، اور پھر بتلایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کچھ کلمات بھی سنائے تھے وہ ہم بیان کرتے ہیں۔

ان قاصدوں نے آیت مذکورہ اکثم بن صیفی کو سنائی، آیت سنتے ہی اکثم نے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مکارم اخلاق کی ہدایت کرتے ہیں اور برے اور رذیل اخلاق سے روکتے ہیں، تم سب ان کے دین میں جلد داخل ہو جاؤ تاکہ تم دوسرے لوگوں سے مقدم اور آگے رہو، پیچھے تابع بن کر نہ رہو (ابن کثیر)

اسی طرح حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شروع میں میں نے لوگوں کے کہنے سننے سے شرماشرمی اسلام قبول کر لیا تھا، مگر میرے دل میں اسلام راسخ نہیں تھا، یہاں تک کہ ایک روز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا، اچانک آپ پر نزولِ وحی کے آثار ظاہر ہوئے، اور بعض عجیب حالات کے بعد آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا قاصد میرے پاس آیا، اور یہ آیت مجھ پر نازل ہوئی، حضرت عثمان بن مظعونؓ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کو دیکھ کر اور آیت سن کر میرے دل میں ایمان مضبوط و مستحکم ہوا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میرے دل میں گھر کر گئی، (ابن کثیر نے یہ واقعہ نقل کر کے فرمایا کہ اسناد اس کی جید ہے)۔

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کے سامنے تلاوت فرمائی تو اس کا تاثر یہ تھا جو اس نے اپنی قوم قریش کے سامنے بیان کیا:

واللہ ان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ وان اصلہ لمورق واعلاہ لمثمر وما ھو بقول بشر | خدا کی قسم اس میں ایک خاص حلاوت ہے اور اس کے اوپر ایک خاص رونق اور نور ہے اس کی جڑ سے شاخیں اور پتے نکلنے والے ہیں اور شاخوں پر پھل لگنے والا ہے، یہ کسی انسان کا کلام ہرگز نہیں ہو سکتا۔

تین چیزوں کا حکم اور تین چیزوں کی ممانعت | اس آیت میں حق تعالیٰ نے تین چیزوں کا حکم دیا ہے، عدل، احسان، اور اہل قرابت کو بخشش، اور تین چیزوں سے منع فرمایا ہے، فحش کام، اور ہر برا کام، اور ظلم و تعدی، ان چھ الفاظ کی شرعی مفہوم اور اس کے حدود کی تشریح یہ ہے:

عَدْل، اس لفظ کے اصلی اور لغوی معنی برابر کرنے کے ہیں، اسی کی مناسبت سے حکام کا لوگوں کے نزاعی مقدمات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ عَدْل کہلاتا ہے، قرآن کریم میں اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اسی معنی کے لئے آیا ہے، اور اسی لحاظ سے لفظ عَدْل افراط تفریط کے درمیان اعتدال کو بھی کہا جاتا ہے، اور اسی کی مناسبت سے بعض ائمہ تفسیر نے اس جگہ لفظ عدل کی تفسیر ظاہر و باطن کی برابری سے کی ہے، یعنی جو قول یا فعل انسان کے ظاہری اعضاء سے سرزد ہو باطن میں بھی اسکا وہی اعتقاد اور حال ہو، اور اصل حقیقت یہی ہے کہ یہاں لفظ عدل اپنے عام معنی میں ہے، جو ان سب صورتوں کو شامل ہے، جو مختلف ائمہ تفسیر سے منقول ہیں، ان میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں۔

اور ابن عربی نے فرمایا کہ لفظ عدل کے اصلی معنی برابری کرنے کے ہیں، پھر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے، مثلاً ایک مفہوم عدل کا یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنے رب کے درمیان عدل کرے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کو اپنے حظِ نفس پر اور اس کی رضا جوئی کو اپنی خواہشات پر مقدم جانے، اور اس کے احکام کی تعمیل اور اس کی ممنوعات و محرمات سے مکمل اجتناب کرے۔

دوسرا عدل یہ ہے کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ عدل کا معاملہ کرے، وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو ایسی تمام چیزوں سے بچائے جس میں اس کی جسمانی یا روحانی ہلاکت ہو، اس کی ایسی خواہشات کو پورا نہ کرے جو اس کے لئے انجام کار مضر ہوں، اور قناعت و صبر سے کام لے، نفس پر بلاوجہ زیادہ بوجھ نہ ڈالے۔

تیسرا عدل اپنے نفس اور تمام مخلوقات کے درمیان ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ تمام مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کرے، اور کسی ادنیٰ اعلیٰ معاملہ میں کسی سے خیانت نہ کرے، سب لوگوں کے لئے اپنے نفس سے انصاف کا مطالبہ کرے، کسی انسان کو اس کے کسی قول و فعل سے ظاہراً یا باطناً کوئی ایذاء اور تکلیف نہ پہونچے۔

اسی طرح ایک عدل یہ ہے کہ جب دو فریق اپنے کسی معاملہ کا محاکمہ اس کے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کرے، اور ایک عدل یہ بھی ہے کہ ہر معاملہ میں افراط و تفریط کی راہوں کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کرے، ابوعبداللہ رازیؒ نے یہی معنی اختیار کر کے فرمایا ہے کہ لفظ عدل میں عقیدہ کا اعتدال، عمل کا اعتدال، اخلاق کا اعتدال سب شامل ہیں (بحر محیط)

امام قرطبیؒ نے عدل کے مفہوم میں اس تفصیل کا ذکر کر کے فرمایا کہ یہ تفصیل بہت بہتر ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس آیت کا صرف لفظ عدل تمام اعمال و اخلاقِ حسنہ کی پابندی اور بُرے اعمال و اخلاق سے اجتناب کو حاوی اور جامع ہے۔

اَلْاِحْسَان، اس کے اصل لغوی معنی اچھا کرنے کے ہیں، اور اس کی دو قسمیں ہیں، ایک یہ فعل یا خُلق و عادت کو اپنی ذات میں اچھا اور مکمل کرے، دوسرے یہ کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ اچھا سلوک اور عمدہ معاملہ کرے، اور دوسرے معنی کے لئے عربی زبان میں لفظ احسان کے ساتھ حرف اِلٰی استعمال ہوتا ہے، جیسا ایک آیت میں اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ فرمایا ہے۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ آیت میں یہ لفظ اپنے عام مفہوم کے لئے مستعمل ہوا ہے، اس لئے احسان کی دونوں قسموں کو شامل ہے، پھر پہلی قسم کا احسان یعنی کسی کام کو اپنی ذات میں اچھا کرنا یہ بھی عام ہے عبادات کو اچھا کرنا، اعمال و اخلاق کو اچھا کرنا، معاملات کو اچھا کرنا۔

حضرت جبرئیلؑ کی مشہور حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کے جو معنی بیان فرمائے ہیں، وہ احسان عبادت کے لئے ہے، اس ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ حضار کا یہ درجہ نصیب نہ ہو تو اتنی بات کا یقین تو ہر شخص کو ہونا ہی چاہیئے کہ حق تعالیٰ اس کے عمل کو دیکھ رہے ہیں، کیونکہ یہ تو اسلامی عقیدہ کا اہم جزء ہے کہ حق تعالیٰ کے علم و بصر کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں رہ سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا حکم اس آیت میں احسان کا آیا ہے، اس میں عبادت کا احسان حدیث کی تشریح کے مطابق بھی داخل ہے، اور تمام اعمال، اخلاق، عادات کا احسان یعنی ان کو مطلوبہ صورت کے مطابق بالکل صحیح و درست کرنا بھی داخل ہے، اور تمام مخلوقات کیساتھ اچھا سلوک کرنا بھی داخل ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر، انسان ہوں یا حیوان۔

امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ جس شخص کے گھر میں اس کی بلی کو اس کی خوراک اور ضروریات نہ ملیں اور جس کے پنجرے میں بند پرندوں کی پوری خبر گیری نہ ہوتی ہو وہ کتنی ہی عبادت کرے محسنین میں شمار نہیں ہوگا۔

اس آیت میں اوّل عدل کا حکم دیا گیا پھر احسان کا بعض ائمہ تفسیر نے فرمایا کہ عدل تو یہ ہے کہ دوسرے کا حق پورا پورا اس کو دیدے اور اپنا وصول کرلے، نہ کم نہ زیادہ، اور کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤ تو ٹھیک اتنی ہی تکلیف تم اس کو پہنچاؤ نہ کم نہ زیادہ، اور احسان یہ ہوگا کہ دوسرے کو اس کے اصل حق سے زیادہ دو اور خود اپنے حق میں چشم پوشی سے کام لو اگر کچھ کم ہو جائے تو بخوشی قبول کرلو، اسی طرح دوسرا کوئی تمہیں ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہونچائے تو تم برابر کا انتقام لینے کے بجائے اس کو معاف کردو، بلکہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دو اسی طرح عدل کا حکم تو فرض و واجب کے درجہ میں ہوا اور احسان کا حکم نفلی اور تبرّع کے طور پر ہوا۔

اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى، تیسرا حکم جو اس آیت میں دیا گیا ہے وہ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى ہے، ایتاء کے معنی اعطاء یعنی کوئی چیز دینے کے ہیں، اور لفظ قُربیٰ کے معنی قرابت اور رشتہ داری کے ہیں، ذی القربیٰ کے معنی رشتہ دار، ذی رحم، ایتاء ذی القربیٰ کے معنی ہوئے رشتہ دار کو کچھ دینا یہاں اس کی تصریح نہیں فرمائی کہ کیا چیز دینا، لیکن ایک دوسری آیت میں اس کا مفعول مذکور ہے فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ، یعنی دو رشتہ دار کو اس کا حق" ظاہر یہی ہے کہ یہاں بھی یہی مفعول مراد ہے، کہ رشتہ دار کو اس کا حق دیا جائے، اس حق میں رشتہ دار کو مال دے کر مالی خدمت کرنا بھی داخل ہے، اور جسمانی خدمت بھی، بیمار پرسی اور خبر گیری بھی، زبانی تسلی و ہمدردی کا اظہار بھی، اور اگرچہ لفظِ احسان میں رشتہ داروں کا حق ادا کرنا بھی داخل تھا مگر اس کو اس کی زیادہ اہمیت بتلانے کے لئے علیحدہ بیان فرمایا گیا۔

یہ تین حکم ایجابی تھے، آگے تین ممانعت و حرمت کے احکام ہیں:۔

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ، یعنی اللہ تعالیٰ منع کرتا ہے فحشاء اور منکر اور بغی سے، فحشاء ہر ایسے بُرے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی بُرائی کھلی ہوئی اور واضح ہو، ہر شخص اس کو بُرا سمجھے، اور منکر وہ قول و فعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہلِ شرع کا اتفاق ہو، اس لئے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جا سکتا، اور لفظ منکر میں تمام گناہ ظاہری اور باطنی، عملی اور اخلاقی سب داخل ہیں، اور بغی کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، مراد اس سے ظلم و عدوان ہے، یہاں اگرچہ لفظ منکر کے مفہوم میں فحشاء بھی داخل ہے اور بغی بھی، لیکن فحشاء کو اس کی انتہائی بُرائی اور شناعت کی وجہ سے الگ کر کے بیان فرمایا اور مقدم کیا، اور بغی کو اس لئے الگ بیان کیا کہ اس کا اثر دوسروں

تک متعدی ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ تعدی باہمی جنگ وجدل تک یا اس سے بھی آگے عالمی فساد تک پہونچ جاتی ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظلم کے سوا کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا بدلہ اور عذاب جلد دیا جاتا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ظلم پر آخرت کا عذاب شدید تو ہونا ہی ہے اس سے پہلے دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ ظالم کو سزا دیتے ہیں، اگرچہ وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ فلاں ظلم کی سزا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مظلوم کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس آیت نے جو چھ حکم ایجابی اور تحریمی دیئے ہیں اگر غور کیا جائے تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مکمل فلاح کا نسخہ اکسیر ہیں۔ رزقنا اللہ تعالیٰ اتباعہ۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ

اور پورا کرو عہد اللہ کا جب آپس میں عہد کرو اور نہ توڑو قسموں کو پکا کرنے

تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا

کے بعد اور تم نے کیا ہو اللہ کو اپنا ضامن اللہ جانتا ہے جو تم

تَفْعَلُوْنَ ۝۹۱ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ

کرتے ہو، اور مت رہو جیسے وہ عورت کہ توڑا اس نے اپنا سوت کاتا ہوا محنت کے بعد

اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ

ٹکڑے ٹکڑے کہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دخل دینے کا بہانہ ایک دوسرے میں اس واسطے کہ ایک فرقہ ہو

اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ

چڑھا ہوا دوسرے سے یہ تو اللہ پرکھتا ہے تم کو اس سے اور آئندہ کھول دے گا اللہ تم کو

الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۹۲ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ

قیامت کے دن، جس بات میں تم جھگڑ رہے تھے، اور اللہ چاہتا تو سب کو

اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

ایک ہی فرقہ کر دیتا لیکن راہ بھلاتا ہے جسکو چاہے اور سجھاتا ہے جسکو چاہے،

وَلَتُسْـَٔـلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۹۳ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا

اور تم سے پوچھ ہوگی جو کام تم کرتے تھے، اور نہ ٹھہراؤ اپنی قسموں کو دھوکا،

بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْۗءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ

آپس میں کہ ڈگ نہ جائے کسی کا پاؤں جمنے کے پیچھے اور تم چکھو سزا اس بات پر کہ تم نے روکا

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۹۴ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ

اللہ کی راہ سے اور تم کو بڑا عذاب ہو، اور نہ لو اللہ کے عہد پر

اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

مول تھوڑا سا، بیشک جو اللہ کے یہاں ہو وہی بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم

تَعْلَمُوْنَ ۝۹۵ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ

جانتے ہو، جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے کبھی ختم نہ ہوگا، اور ہم بدلہ دیں گے

الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۶

صبر کرنیوالوں کو ان کا حق اچھے کاموں پر جو کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

ایفاء عہد کا حکم اور عہد شکنی کی مذمت

اور تم اللہ کے عہد کو (یعنی جس عہد کے پورا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو) پورا کرو (اس سے وہ محل گیا جو خلافِ شرع عہد ہو اور باقی سب عہود مشروعہ خواہ متعلق حقوق اللہ کے ہوں یا متعلق حقوق العباد کے ہوں اس میں داخل ہوگئے) جبکہ تم اس کو (تخصیصاً یا تعمیماً) اپنے ذمہ کرلو (تخصیصاً یہ کہ صراحۃً کسی کام کا ذمہ لے لیا اور تعمیماً یہ کہ ایمان لائے تو تمام احکام واجبہ کی ذمہ داری اس کے ضمن میں آگئی) اور (بالخصوص جن عہود میں قسم بھی کھائی ہو وہ زیادہ قابلِ اہتمام ہیں، سو ان میں) قسموں کو بعد ان کے مستحکم کرنے کے (یعنی اللہ کا نام لے کر قسم کھانے کے) مت توڑو اور تم (ان قسموں کی وجہ سے ان عہود میں) اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی بنا چکے ہو (یہ قیدیں بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا اور قَدْ جَعَلْتُمُ، قیدِ واقعی ہیں وفاءِ عہد پر تنبیہ کے لئے تصریح کی گئی) بیشک اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ تم کرتے ہو (خواہ وفاء یا عہد شکنی پس اسی کے موافق تم کو جزاء و سزا دے گا اور تم (نقضِ عہد کرکے) اس (عورت) کے

مشابہ مت ہو جس نے اپنا سوت کاتنے پیچھے بوٹی بوٹی کر کے توڑ ڈالا کہ (اس کی طرح) تم (بھی) اپنی قسموں کو بعد درستی کے توڑ کر ان کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بنانے لگو (کیونکہ قسم و عہد توڑنے سے موافقین کو بے اعتباری اور مخالفین کو برانگیختگی پیدا ہوتی ہے، اور یہ اصل ہے فساد کی اور توڑنا بھی محض اس وجہ سے کہ) ایک گروہ دوسرے گروہ سے (کثرت یا ثروت میں) بڑھ جائے (یعنی مثلاً کفار کے دو گروہوں میں باہم مخالفت ہو اور تمہاری ایک سے صلح ہو جائے پھر دوسری طرف پلہ جھکتا ہوا دیکھ کر جس گروہ سے صلح کی تھی اس سے غدر کر کے دوسرے گروہ سے سازش کر لے، یا مثلاً کوئی مسلمان ہو کر مسلمانوں میں شامل ہو اور پھر کافروں کی طرف زور دیکھا تو عہد اسلام کو توڑ کر مرتد ہو جائے، اور یہ جو ایک گروہ دوسرے سے بڑھا ہوا ہوتا ہے یا دوسری کسی جماعت کے شامل ہو جانے سے بڑھ جاتا ہے، تو) بس اس (زائد ہونے) سے اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کرتا ہے (کہ دیکھیں وفاء عہد کرتے ہو یا جھکتا پلہ دیکھ کر ادھر ڈھل جاتے ہو) اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے (اور مختلف راہیں چلتے رہے) قیامت کے دن ان سب (کی حقیقت) کو تمہارے سامنے (عملاً) ظاہر کر دے گا (کہ حق والوں کو جزاء اور باطل والوں کو سزا ہو جائے گی، آگے اس اختلاف کی حکمت بطور جملہ معترضہ کے اجمالاً بیان فرماتے ہیں) اور (ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی قدرت تھی کہ اختلاف نہ ہونے دیتے، چنانچہ) اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا (لیکن) بمقتضائے حکمت جس کی تفصیل و تعیین یہاں ضروری نہیں) جس کو چاہتے ہیں بے راہ کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں راہ پر ڈال دیتے ہیں (چنانچہ منجملہ ہدایت کے وفائے عہد اور منجملہ ضلالت کے نقض عہد بھی ہے) اور یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جیسے دنیا میں گمراہوں کو پوری سزا نہیں ہوتی ایسے ہی آخرت میں مطلق العنان رہیں گے ہرگز نہیں بلکہ قیامت میں) تم سے تمہارے سب اعمال کی ضرور باز پرس ہوگی اور (جیسا نقض عہد و قسم سے محسوس ضرر ہوتا ہے جس کا اوپر بیان تھا، اسی طرح اس سے معنوی ضرر بھی ہوتا ہے، آگے اسی کا ذکر ہے یعنی) تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ مت بناؤ (یعنی قسموں اور عہدوں کو مت توڑو، کبھی اس کو دیکھ کر کسی اور کا قدم جمنے کے بعد نہ پھسل جائے، یعنی دوسرے بھی تمہاری تقلید کریں، اور عہد شکنی کرنے لگیں) پھر تم کو اس سبب سے کہ تم (دوسروں کے لئے) راہ خدا سے مانع ہوئے تکلیف بھگتنا پڑے (کیونکہ وفاء عہد راہ خدا ہے تم اس کے توڑنے کے سبب بن گئے اور یہی ہے وہ معنوی ضرر کہ دوسروں کو بھی عہد شکن بنایا اور تکلیف یہ ہوگی کہ اس حالت میں) تم کو بڑا عذاب ہوگا اور (جس طرح گروہ غالب میں شامل ہو کر جاہ حاصل کرنے کی غرض سے نقض عہد

ممنوع ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اسی طرح تحصیل مال کی غرض سے جو عہد توڑا ہو اس کی ممانعت فرماتے ہیں کہ) اور تم لوگ عہد خداوندی کے عوض میں (دنیا کا) تھوڑا سا فائدہ مت حاصل کرو (عہد خداوندی کے معنی تو شروع آیت میں معلوم ہوئے اور ثمن قلیل سے مراد دنیا ہے کہ باوجود کثیر ہونے کے بھی قلیل ہی ہے، اس کی حقیقت اس طرح بیان فرمائی کہ) پس اللہ کے پاس جو چیز ہے (یعنی ذخیرۂ آخرت) وہ تمہارے لئے (متاع دنیوی سے) بدرجہا بہتر ہے اگر تم سمجھنا چاہو (پس متاع آخرت کثیر ہوئی اور متاع دنیوی خواہ کتنی بھی ہو قلیل ہوئی) اور (علاوہ تفاوت قلیل و کثیر کے دوسرا تفاوت یہ بھی ہے کہ) جو کچھ تمہارے پاس (دنیا میں) ہے وہ (ایک روز) ختم ہو جائے گا، خواہ زوال سے یا موت سے) اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا اور جو لوگ (وفائے عہد وغیرہ احکام دین پر) ثابت قدم ہیں ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر (یعنی نعمت باقیہ مذکورہ) ان کو ضرور دیں گے (پس وفائے عہد کر کے دولت کثیرہ غیر فانیہ کو حاصل کرو اور قلیل فانی کے لئے نقض عہد مت کرو)

معارف و مسائل

عہد شکنی حرام ہے لفظ عہد ان تمام معاملات و معاہدات کو شامل ہے جن کا زبان سے التزام کیا جائے یعنی اس کی ذمہ داری لی جائے خواہ اس پر قسم کھائے یا نہ کھائے، خواہ وہ کسی کام کے کرنے سے متعلق ہو یا نہ کرنے سے۔

اور یہ آیات درحقیقت آیت سابقہ کی تشریح و تکمیل ہیں، آیت سابقہ میں عدل و احسان کا حکم تھا، لفظ عدل کے مفہوم میں ایفاء عہد بھی داخل ہے (قرطبی)

کسی سے عہد معاہدہ کرنے کے بعد عہد شکنی کرنا بڑا گناہ ہے، مگر اس کے توڑنے پر دنیوی کفارہ مقرر نہیں، بلکہ آخرت کا عذاب ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے روز عہد شکنی کرنے والے کی پشت پر ایک جھنڈا نصب کر دیا جائے گا، جو میدان حشر میں اس کی رسوائی کا سبب بنے گا۔

اسی طرح جس کام کی قسم کھائی اس کے خلاف کرنا بھی گناہ کبیرہ ہے، آخرت میں وبال عظیم ہے اور دنیا میں بھی اس کی خاص صورتوں میں کفارہ لازم ہوتا ہے (قرطبی)

اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ، اس آیت میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جس جماعت سے تمہارا معاہدہ ہو جائے اس معاہدہ کو دنیوی اغراض و منافع کے لئے نہ توڑو مثلاً تمہیں یہ محسوس ہو کہ جس جماعت یا پارٹی سے معاہدہ ہوا ہے یہ کمزور اور تعداد میں قلیل ہے،

یا مال کے اعتبار سے مفلس ہیں، اور اس کے بالمقابل دوسری جماعت کثیر اور قوی ہے یا مال و دولت والی ہے، تو صرف اس طمع سے کہ قوی اور مالدار پارٹی میں شامل ہو جانے سے منافع زیادہ ہوں گے، پہلی جماعت کا عہد توڑنا جائز نہیں، بلکہ اپنے عہد پر قائم رہے اور نفع و ضرر کو خدا تعالیٰ کے سپرد کرے، البتہ جس جماعت یا پارٹی سے عہد کیا ہے، وہ اگر خلافِ شرع امور کا ارتکاب کرے اور کرائے تو اس کا عہد توڑ دینا واجب ہے، بشرطیکہ واضح طور پر ان کو جتلا دیا جائے کہ ہم اب اس عہد کے پابند نہیں رہیں گے، جیسا کہ آیت فَانۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ میں مذکور ہے۔

آخر آیت میں مذکورہ صورتِ حال کو مسلمان کی آزمائش کا ذریعہ بتلایا گیا ہے، کہ حق تعالیٰ اس کا امتحان لیتے ہیں، کہ یہ اپنے نفس کی اغراض و خواہشات کا تابع ہو کر عہد کو توڑ ڈالتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں نفسانی جذبات کو قربان کرتا ہے۔

کسی کو دھوکہ دینے کے لئے قسم کھانے میں سلب ایمان کا خطرہ ہے

وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًا ، اس آیت میں ایک اور عظیم گناہ اور وبال سے بچانے کی ہدایت ہے، وہ یہ کہ قسم کھاتے وقت ہی سے اس قسم کے خلاف کرنے کا ارادہ ہو صرف مخاطب کو فریب دینے کے لئے قسم کھائی جائے تو یہ عام قسم توڑنے سے زیادہ خطرناک گناہ ہے، جس کے نتیجہ میں یہ خطرہ ہے کہ ایمان کی دولت ہی سے محروم ہو جائے، فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعۡدَ ثُبُوۡتِهَا کا یہی مطلب ہے۔

رشوت لینا سخت حرام اور اللہ سے عہد شکنی ہے

وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ، یعنی اللہ کے عہد کو تھوڑی سی قیمت کے بدلے میں نہ توڑو، یہاں تھوڑی سی قیمت سے مراد دنیا اور اس کے منافع ہیں وہ مقدار میں کتنے بھی بڑے ہوں، آخرت کے منافع کے مقابلہ میں ساری دنیا اور اس کی ساری دولتیں بھی قلیل ہی ہیں، جس نے آخرت کے بدلے میں دنیا لے لی اس نے انتہائی خسارہ کا سودا کیا ہے، کہ ہمیشہ رہنے والی اعلیٰ ترین نعمت و دولت کو بہت جلد فنا ہونے والی گھٹیا قسم کی چیز کے عوض بیچ ڈالا، کوئی سمجھ بوجھ والا انسان گوارا نہیں کر سکتا۔

ابن عطیہ نے فرمایا کہ جس کام کا پورا کرنا کسی شخص کے ذمہ واجب ہو وہ اللہ کا عہد اس کے ذمہ ہے، اس کے پورا کرنے پر کسی سے معاوضہ لینا اور بغیر لئے نہ کرنا اللہ کا عہد توڑنا ہے، اسی طرح جس کام کا نہ کرنا کسی کے ذمہ واجب ہے کسی سے معاوضہ لے کر اس کو کر دینا یہ بھی اللہ کا عہد توڑنا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رشوت کی مروجہ قسمیں سب حرام ہیں، جیسے کوئی سرکاری ملازم کسی کام کی تنخواہ حکومت سے پاتا ہے تو اس نے اللہ سے عہد کر لیا ہے کہ یہ تنخواہ لے کر مفوضہ

خدمت پوری کروں گا، اب اگر وہ اس کے کرنے پر کسی سے معاوضہ مانگے اور بغیر معاوضہ اس کو ٹلائے تو یہ عہد اللہ کو توڑ رہا ہے، اسی طرح جس کام کا اس کو محکمہ کی طرف سے اختیار نہیں اس کو رشوت لے کر کر ڈالنا بھی اللہ سے عہد شکنی ہے (بحر محیط)

رشوت کی جامع تعریف

ابن عطیہ کے اس کلام میں رشوت کی جامع مانع تعریف بھی آگئی، جو تفسیر بحر محیط کے الفاظ میں یہ ہے،

اخذ الاموال علی فعل ما یجب علی الآخذ فعلہ او فعل ما یجب علیہ ترکہ	"یعنی جس کام کا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا یا جس کام کا چھوڑنا اس کے ذمہ لازم ہو اس کے کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے (تفسیر بحر محیط، ص ۵۳۳ ج ۵)

اور پوری دنیا کی ساری نعمتوں کا قلیل ہونا اگلی آیت میں اس طرح بیان فرمایا، مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ ، یعنی جو کچھ تمہارے پاس ہے (مراد اس سے دنیوی منافع ہیں) وہ سب ختم اور فنا ہونے والا ہے، اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے (مراد اس سے آخرت کا ثواب و عذاب ہی) وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

دنیا کی راحت و کلفت، دوستی، دشمنی سب فنا ہونے والے ہیں اور ان کے ثمرات و نتائج جو اللہ کے پاس ہیں وہ باقی رہنے والے ہیں

مَا عِنۡدَكُمۡ کے لفظ سے عام طور پر ذہن صرف مال و متاع کی طرف جاتا ہے، استاذ محترم مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لفظ مَا لغت کے اعتبار سے عام ہے اور عموم کے معنی مراد لینے سے کوئی امر شرعی مانع نہیں، اس لئے اس میں دنیا کا مال و متاع بھی داخل ہے، اور اس میں پیش آنے والے تمام حالات و معاملات، خوشی اور غم، رنج اور راحت، بیماری اور صحت، نفع اور نقصان کسی کی دوستی یا دشمنی یہ سب چیزیں شامل ہیں کہ سب کی سب فنا ہونے والی ہیں، البتہ ان حالات و معاملات پر جو آثار مرتب ہونے والے ہیں اور قیامت میں اُن پر عذاب و ثواب ہونے والا ہے وہ سب باقی رہنے والے ہیں، فنا ہو جانے والے حالات و معاملات کی دھن میں لگا رہنا اور اپنی زندگی اور اس کی توانائی کو اسی کی فکر میں لگا کر دائمی عذاب و ثواب سے غفلت برتنا کسی ذی عقل کا کام نہیں ؎

دورانِ بقا چو بادِ صحرا بگذشت | تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت
پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد | بر گردنِ وے بماند و بر ما بگذشت

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً

جس نے کیا نیک کام مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان پر ہو تو اس کو ہم زندگی دیں گے ایک

طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

اچھی زندگی اور بدلے میں دیں گے ان کو حق ان کا بہتر کاموں پر جو کرتے تھے۔

خلاصۂ تفسیر

(اس سے پہلی آیات میں ایفاء عہد کی تاکید اور عہد شکنی کی مذمت کا بیان تھا جو ایک خاص عمل ہے اس آیت میں تمام اعمالِ صالحہ اور عاملین صالحین کا عمومی بیان ہے، مضمون آیت کا یہ ہے، کہ آخرت کا اجر و ثواب اور دنیا کی برکات صرف ایفائے عہد میں منحصر نہیں اور نہ کسی عمل کی تخصیص ہے بلکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ) جو شخص بھی کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ صاحب ایمان ہو (کیونکہ کافر کے اعمالِ صالحہ مقبول نہیں) تو ہم اس شخص کو (دنیا میں تو) بالطف زندگی دیں گے اور (آخرت میں) ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔

معارف و مسائل

حیاتِ طیبہ کیا چیز ہے؟ جمہور مفسرین کے نزدیک یہاں حیاتِ طیبہ سے مراد دنیا کی پاکیزہ اور بالطف زندگی ہے، اور بعض ائمہ تفسیر نے اس سے آخرت کی زندگی مراد لی ہے، اور جمہور کی تفسیر کے مطابق بھی اس سے یہ مراد نہیں کہ اس کو کبھی فقر و فاقہ یا بیماری پیش نہ آئے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ مؤمن کو اگر کبھی معاشی تنگی یا کوئی تکلیف بھی پیش آتی ہے تو دو چیزیں اس کو پریشان نہیں ہونے دیتیں، ایک قناعت اور سادہ زندگی کی عادت جو تنگدستی میں بھی چل جاتی ہے، دوسرے اس کا یہ عقیدہ کہ مجھے اس تنگی اور بیماری کے بدلے میں آخرت کی عظیم الشان دائمی نعمتیں ملنے والی ہیں، بخلاف کافر و فاجر کے کہ اگر اس کو تنگدستی اور بیماری پیش آتی ہے، تو اس کے لئے کوئی تسلی کا سامان نہیں ہوتا، عقل و ہوش کھو بیٹھتا ہے، بعض اوقات خودکشی کی نوبت آجاتی ہے، اور اگر اس کو فراخیٔ عیش بھی نصیب ہو تو اس کو زیادتی کی حرص کسی وقت چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، وہ کروڑپتی ہو جاتا ہے، تو ارب پتی بننے کی فکر اس کے عیش کو خراب کرتی رہتی ہے۔

ابن عطیہؒ نے فرمایا کہ مؤمنین صالحین کو حق تعالیٰ دنیا میں بھی وہ فرحت و انبساط اور پُرلطف زندگی عطا فرماتے ہیں جو کسی حال میں متغیر نہیں ہوتی، تندرستی اور فراخ دستی کے وقت

تو ان کی زندگی کا پُرلطف ہونا ظاہر ہے ہی، خصوصاً اس بناء پر کہ بلا ضرورت مال کو بڑھانے کی حرص ان میں نہیں ہوتی جو انسان کو ہر حال میں پریشان رکھتی ہے، اور اگر تنگدستی یا بیماری بھی پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر اُن کا مکمل یقین اور مشکل کے بعد آسانی (کلفت کے بعد راحت ملنے) کی قوی اُمید ان کی زندگی کو بے لطف نہیں ہونے دیتی، جیسے کاشتکار کھیت بو لے اور اس کی پرورش کے وقت اس کو کتنی ہی تکلیفیں پیش آجائیں سب کو اس لئے راحت محسوس کرتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کا بڑا اصلہ اس کو ملنے والا ہے، تاجر اپنی تجارت میں، ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے میں کیسی کیسی محنت و مشقت بلکہ بعض اوقات ذلت بھی برداشت کرتا ہے، مگر اس لئے خوش رہتا ہے کہ چند روز کے بعد اس کو تجارت کا بڑا نفع یا ملازمت کی تنخواہ ملنے کا یقین ہوتا ہے، مؤمن کا بھی یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ مجھے ہر تکلیف پر اجر مل رہا ہے اور آخرت میں اس کا بدلہ دائمی عظیم الشان نعمتوں کی صورت میں ملے گا، اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے یہاں کے رنج و راحت اور سرد و گرم سب کو آسانی سے برداشت کر لیتا ہے، اس کی زندگی ایسے حالات میں بھی مشوّش اور بے لطف نہیں ہوتی، یہی وہ حیاتِ طیبہ ہے جو مؤمن کو دنیا میں نقد ملتی ہے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾

سو جب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی شیطان مردود سے

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾

اس کا زور نہیں چلتا اُن پر جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ

اس کا زور تو انہی پر ہے جو اس کو رفیق سمجھتے ہیں اور جو اس کو

بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع

شریک مانتے ہیں۔

ربطِ آیات سابقہ آیات میں اوّل ایفاءِ عہد کی تاکید اور مطلقاً اعمالِ صالحہ کی تاکید و ترغیب کا بیان آیا ہے، انسان کو ان احکام میں غفلت اغواءِ شیطانی سے پیدا ہوتی ہے،

اس لئے اس آیت میں شیطانِ رجیم سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے، جس کی ضرورت ہر نیک عمل میں ہے، مگر اس آیت میں اس کو خاص طور سے قراءتِ قرآن کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اس تخصیص کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تلاوتِ قرآن ایک ایسا عمل ہے جس سے خود شیطان بھاگتا ہے ؎

دیو بگریزد ازاں قوم کہ قرآں خوانند

اور بعض خاص آیات اور سورتیں بالخاصہ شیطانی اثرات کو زائل کرنے کیلئے مجرب ہیں جن کا مؤثر و مفید ہونا نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہے (دیباچہ قرآن)، اس کے باوجود جب تلاوتِ قرآن کے ساتھ شیطان سے تعوذ کا حکم دیا گیا تو دوسرے اعمال کے ساتھ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا۔

اس کے علاوہ خود تلاوتِ قرآن میں شیطانی وساوس کا بھی خطرہ رہتا ہے، کہ تلاوت کے آداب میں کمی ہو جائے، تدبر و تفکر اور خشوع خضوع نہ رہے تو اس کے لئے بھی وساوسِ شیطانی سے پناہ مانگنا ضروری سمجھا گیا (ابن کثیر، مظہری وغیرہ)

خلاصۂ تفسیر

(اور جب عملِ صالح کی فضیلت معلوم ہوئی، اور کبھی کبھی شیطان اس میں خلل ڈالتا ہے کبھی وفاتے عہد میں بھی خلل ڈالتا ہے اور کبھی دوسرے عمل مثل قراءتِ قرآن میں بھی) تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اور آپ کے واسطہ سے آپ کی امت سن لیں کہ) جب آپ (کیسا ہی نیک کام کرنا چاہیں حتیٰ کہ) قرآن پڑھنا چاہیں تو شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں (اصلاً تو دل سے خدا پر نظر رکھنا ہے اور یہی حقیقت استعاذہ کی واجب ہے، اور قراءت میں پڑھ لینا زبان سے بھی مسنون ہے، اور پناہ مانگنے کا حکم ہم اس لئے دیتے ہیں کہ) یقیناً اس کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں، اور اپنے رب پر (دل سے) بھروسہ رکھتے ہیں، بس اس کا قابو تو صرف ان ہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان لوگوں پر (چلتا ہے) جو کہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

معارف و مسائل

ابن کثیرؒ نے مقدمۂ تفسیر میں فرمایا کہ انسان کے دشمن دو قسم کے ہیں، ایک خود نوعِ انسانی میں سے جیسے عام کفار، دوسرے جنات میں سے جو شیطان نافرمان ہیں، پہلی قسم کے دشمن کے ساتھ اسلام نے جہاد و قتال کے ذریعہ مدافعت کا حکم دیا ہے، مگر دوسری قسم کے لئے صرف اللہ سے پناہ مانگنے کا حکم ہوا، اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی قسم کا دشمن اپنی ہی جنس و نوع سے ہے اس کا حملہ ظاہر ہو کر ہوتا ہے اس لئے اس سے جہاد و قتال فرض کر دیا گیا، اور دشمن شیطانی نظر نہیں آتا، اس کا حملہ بھی انسان پر آمنے سامنے

۲۶

نہیں ہوتا، اس لئے اس کی مدافعت کے لئے ایک ایسی ذات کی پناہ لینا واجب کیا گیا جو نہ انسان کو نظر آتی ہے نہ شیطان کو، اور شیطان کی مدافعت کو حوالہ بخدا تعالیٰ کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ جو اس سے مغلوب ہو جائے وہ اللہ کے نزدیک راندۂ درگاہ اور مستحق عذاب ہے، بخلاف عدوِ انسانی یعنی کفار کہ ان کے مقابلہ میں کوئی شخص مغلوب ہو جائے یا مارا جائے تو وہ شہید اور مستحق ثواب ہے، اس لئے عدوِ انسانی کا مقابلہ اعضاء و جوارح کیساتھ ہر حال میں نفع ہی نفع ہے یا دشمن غالب آگیا تو اس کی قوت کو ختم کر دیگا یا پھر خود شہید ہو کر عند اللہ ماجور ہوگا۔

مسئلہ:۔ تلاوتِ قرآن سے پہلے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کا پڑھنا اس آیت کی تعمیل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، مگر کبھی کبھی اس کا ترک کرنا بھی احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے، اس لئے جمہور علماءِ امت نے اس حکم کو واجب نہیں بلکہ سنت قرار دیا ہے، اور ابن جریر طبریؒ نے اس پر اجماعِ امت نقل کیا ہے، اس معاملے میں روایاتِ حدیث قولی اور عملی، تلاوت سے پہلے اکثر حالات میں اعوذ باللہ پڑھنے کی اور بعض حالات میں نہ پڑھنے کی یہ سب ابن کثیر نے اپنی تفسیر کے شروع میں مبسوط ذکر کی ہیں۔

مسئلہ:۔ نماز میں تعوذ (یعنی اعوذ باللہ) صرف پہلی رکعت کے شروع میں پڑھا جائے یا ہر رکعت کے شروع میں، اس میں ائمۂ فقہاء کے اقوال مختلف ہیں، امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف پہلی رکعت میں پڑھنا چاہئے، اور امام شافعیؒ ہر رکعت کے شروع میں پڑھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں، دونوں کے دلائل تفسیر مظہری میں مبسوط لکھے گئے ہیں (ص ۳۹ ج ۵)

مسئلہ:۔ تلاوتِ قرآن نماز میں ہو یا خارج نماز دونوں صورتوں میں تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے، مگر ایک دفعہ پڑھ لیا تو آگے جتنا پڑھتا رہے وہی ایک تعوذ کافی ہے، البتہ تلاوت کو درمیان میں چھوڑ کر کسی دنیوی کام میں مشغول ہو گیا اور پھر دوبارہ شروع کیا، تو اس وقت دوبارہ تعوذ اور بسم اللہ پڑھنا چاہئے۔

مسئلہ:۔ تلاوتِ قرآن کے علاوہ کسی دوسرے کلام یا کتاب پڑھنے سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت نہیں، وہاں صرف بسم اللہ پڑھنا چاہئے، (در مختار و شامی)۔

البتہ مختلف اعمال اور حالات میں تعوذ کی تعلیم حدیث میں منقول ہے، مثلاً جب کسی کو غصہ زیادہ آئے تو حدیث میں ہے کہ (اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم) پڑھنے سے شدتِ غضب فرو ہو جاتی ہے (ابن کثیر)

نیز حدیث میں ہے کہ بیت الخلاء میں جانے سے پہلے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ، پڑھنا مستحب ہے (شامی)

اللہ تعالیٰ پر ایمان و توکل شیطانی تسلط سے نجات کا راستہ

اس آیت میں یہ واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ایسی قوت نہیں دی کہ وہ کسی بھی انسان کو بُرائی پر مجبور و بے اختیار کر دے، انسان خود اپنے اختیار و قدرت کو غفلت یا کسی غرض نفسانی سے استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے، اسی لئے فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے احوال و اعمال میں اپنی قوتِ ارادی کے بجائے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہی ہر خیر کی توفیق دینے والا اور ہر شر سے بچانے والا ہے، ایسے لوگوں پر شیطان کا تسلط نہیں ہوتا، ہاں جو اپنے اغراضِ نفسانی کے سبب شیطان ہی سے دوستی کرتے ہیں، اُسی کی باتوں کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اُن پر شیطان مسلط ہو جاتا ہے کہ کسی خیر کی طرف نہیں جانے دیتا، اور ہر بُرائی میں وہ آگے آگے ہوتے ہیں۔

یہی مضمون سورۂ حجر کی آیت کا ہے جس میں شیطان کے دعوے کے مقابلہ میں خود حق تعالیٰ نے یہ جواب دیدیا ہے: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ "یعنی میرے خاص بندوں پر تیرا تسلط نہیں ہو سکتا ہاں اس پر ہو گا جو خود ہی گمراہ ہو اور تیرا اتباع کرنے لگے"۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ

اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کی جگہ دوسری آیت اور اللہ خوب جانتا ہے جو اتارتا ہے تو کہتے ہیں تو تو

اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ

بنا لاتا ہے یہ بات نہیں، پر اکثروں کو اُن میں خبر نہیں، تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک

الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّ

فرشتے نے تیرے رب کی طرف سے بلا شبہ تاکہ ثابت کرے ایمان والوں کو اور ہدایت اور

بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ

خوش خبری مسلمانوں کے واسطے، اور ہم کو خوب معلوم ہے کہ وہ کہتے ہیں اس کو سکھلاتا ہے،

بَشَرٌ ۭ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ

ایک آدمی، جس کی طرف تعریض کرتے ہیں اس کی زبان ہے عجمی اور یہ قرآن زبان

عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا یَهْدِیْهِمُ

عربی ہے صاف، وہ لوگ جن کو اللہ کی باتوں پر یقین نہیں ان کو اللہ راہ

اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا یَفْتَرِی الْكَذِبَ الَّذِیْنَ لَا

نہیں دیتا اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے، جھوٹ تو وہ لوگ بناتے ہیں جن کو یقین

یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

نہیں اللہ کی باتوں پر اور وہی لوگ جھوٹے ہیں

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

اس سے پہلی آیت میں تلاوتِ قرآن کے وقت اعوذ باللہ پڑھنے کی ہدایت تھی، جس میں اشارہ ہے کہ شیطان تلاوت کے وقت انسان کے دل میں وسوسے ڈالتا ہے، مذکورہ آیات میں اسی طرح کے وساوس شیطانی کا جواب ہے۔

نبوت پر کفار کے شبہات کا جواب مع تہدید

اور جب ہم کسی آیت کو بجائے دوسری آیت کے بدلتے ہیں (یعنی ایک آیت کو لفظاً یا معنیً منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم بھیجدیتے ہیں) اور حالانکہ اللہ تعالیٰ جو حکم (پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ) بھیجتا ہے (اس کی مصلحت و حکمت کو) وہی خوب جانتا ہے کہ جن کو حکم دیا گیا ہے ان کے حالات کے اعتبار سے ایک وقت میں مصلحت کچھ تھی، پھر حالت بدل جانے سے مصلحت اور حکمت دوسری ہو گئی) تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) آپ (خدا پر) افتراء کرنے والے ہیں (کہ اپنے کلام کو اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، ورنہ اللہ کا حکم ہوتا تو اس کے بدلنے کی کیا ضرورت تھی، کیا اللہ تعالیٰ کو پہلے علم نہ تھا۔ اور یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ بعض اوقات سب حالات کا علم ہونے کے باوجود پہلی حالت پیش آنے پر پہلا حکم دیا جاتا ہے اور دوسری حالت پیش آنے کا اگرچہ اس وقت بھی علم ہے مگر بتقاضائے مصلحت اس دوسری حالت کا حکم اس وقت بیان نہیں کیا جاتا، بلکہ جب وہ حالت پیش آجاتی ہے اس وقت بیان کیا جاتا ہے، جیسے طبیب ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ اس کے استعمال سے حالت بدلے گی، اور پھر دوا دوسری دی جائے گی، مگر مریض کو ابتداء میں سب تفصیل نہیں بتلاتا، یہی حقیقت نسخ احکام کی ہے جو قرآن و سنت میں ہوتا ہے، جو حقیقت سے واقف نہیں وہ باغوا شیطانی نسخ کا انکار کرنے لگتے ہیں، اسی لئے اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے

فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مفتری نہیں) بلکہ انہی میں اکثر لوگ جاہل ہیں (کہ احکام میں نسخ کو بلا کسی دلیل کے کلام الٰہی ہونے کے خلاف سمجھتے ہیں) آپ (ان کے جواب میں) فرما دیجئے (کہ یہ کلام میرا بنایا ہوا نہیں بلکہ اس کو) روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لائے ہیں (اس لئے یہ اللہ کا کلام ہے اور اس میں احکام کی تبدیلی بمقتضائے حکمت و مصلحت ہوا اور یہ کلام اس لئے بھیجا گیا ہے) تاکہ ایمان والوں کو (ایمان پر) ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوش خبری (کا ذریعہ) ہو جائے (اس کے بعد کفار کے ایک اور لغو شبہ کا جواب ہے) اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ (ایک دوسری غلط بات) یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو تو آدمی سکھلاتا ہے (اس سے مراد ایک عجمی رومی کا باشندہ لوہار ہے جس کا نام بلعام یا مقیس تھا، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں جی لگا کر سنتا تو حضورؐ کبھی اس کے پاس جا بیٹھتے اور وہ کچھ انجیل وغیرہ کو بھی جانتا تھا، اس پر کافروں نے یہ بات چلتی کی کہ یہی شخص حضورؐ کو قرآن کا کلام سکھاتا ہے، کذا فی الدر المنثور، اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ قرآن مجید تو مجموعہ الفاظ و معانی کا نام ہے تم لوگ اگر قرآن کریم کے معانی اور معارف کو نہیں پہچان سکتے تو کم از کم عربی زبان کی معیاری فصاحت و بلاغت سے تو ناواقف نہیں ہو تو اتنا تو تمہیں سمجھنا چاہئے کہ اگر بالفرض قرآن کے معانی اس شخص نے سکھلا دیئے ہوں تو کلام کے الفاظ اور ان کی ایسی فصاحت و بلاغت جس کا مقابلہ کرنے سے پورا عرب عاجز ہو گیا یہ کہاں سے آ گئی، کیونکہ جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی ہے۔ (کوئی عجمی بیچارہ ایسی عبارت کیسے بنا سکتا ہے، اور اگر کہا جائے کہ عبارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنائی ہوگی تو اس کا واضح جواب اس تحدی (چیلنج) سے پوری طرح ہو چکا ہے جو سورۂ بقرہ میں آ چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باذنِ خداوندی اپنی نبوت اور قرآن کی حقانیت کا معیار اسی کو قرار دیدیا تھا، کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق یہ انسان کا کلام ہو تو تم بھی انسان ہو اور بڑی فصاحت و بلاغت کے مدعی ہو تو تم اس جیسا کلام زیادہ نہیں تو ایک آیت ہی کی برابر لکھ لاؤ، مگر سارا عرب باوجود یہ کہ آپ کے مقابلہ میں اپنا سب کچھ جان و مال قربان کرنے کو تیار تھا، مگر اس چیلنج کو قبول کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی، اس کے بعد منکرین نبوت اور قرآن پر ایسے اعتراضات کرنے والوں پر وعید و تہدید ہے کہ) جو لوگ اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے ان کو اللہ تعالیٰ کبھی راہ پر نہ لائیں گے اور ان کے لئے دردناک سزا ہوگی (اور یہ لوگ جو نعوذ باللہ آپ کو مفتری کہتے ہیں) جھوٹ افترا کرنے والے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ لوگ ہیں پورے جھوٹے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ

جو کوئی منکر ہو اللہ سے یقین لانے کے پیچھے مگر وہ نہیں جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا

مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا

دل برقرار ہے ایمان پر ولیکن جو کوئی دل کھول منکر ہوا

فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذٰلِكَ

سو ان پر غضب ہے اللہ کا اور ان کو بڑا عذاب ہے ، یہ

بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ

اس واسطے کہ انھوں نے عزیز رکھا دنیا کی زندگی کو آخرت سے اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى

راستہ نہیں دیتا منکر لوگوں کو، یہ وہی ہیں کہ مہر کر دی اللہ نے ان کے

قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

دل پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر اور یہی ہیں بے ہوش ،

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

خود ظاہر ہے کہ آخرت میں یہی لوگ خراب ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے (اس میں کفر بالرسول اور انکار قیامت وغیرہ سب داخل ہیں) مگر جس شخص پر (کافروں کی طرف سے) زبردستی کی جائے (کہ اگر تو کفر کا فلاں کلام یا فلاں قول نہیں کرے گا تو ہم تجھ کو قتل کر دیں گے مثلاً اور حالات سے اس کا اندازہ بھی ہو کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں) بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو (یعنی عقیدے میں کوئی فتور نہ آئے اور اس قول و فعل کو سخت گناہ اور برا سمجھتا ہو تو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے کہ اس کا ظاہری طور پر کلمۂ کفر یا فعلِ کفر میں مبتلا ہو جانا ایک عذر کی بنا پر ہے، اس لئے جو وعید ارتداد کی آگے آ رہی ہے وہ ایسے شخص کے لئے نہیں) لیکن ہاں جو جی کھول کر (یعنی اس کفر کو صحیح اور مستحسن سمجھ کر) کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا، اور

ان کو بڑی سزا ہوگی (اور) یہ (غضب وعذاب) اس سبب سے ہوگا کہ انھوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا، اور اس سبب سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافر لوگوں کو (جو دنیا کو ہمیشہ آخرت پر ترجیح دیں) ہدایت نہیں کیا کرتا (یہ دو سبب الگ الگ نہیں بلکہ مجموعہ سبب ہو حاصل اس کا یہ ہو کہ عزم فعل کے بعد عادۃ اللہ یہ ہو کہ خلق فعل ہوتا ہے جس پر صدور فعل مرتب ہوتا ہے، یہاں استحبوا سے عزم اور لا یہدی سے خلق کی طرف اشارہ ہے، اور اس مجموعہ پر فعل قبیح کا صدور مرتب ہے) یہ وہ لوگ ہیں کہ (دنیا میں ان کے اصرار علی الکفر کی حالت یہ ہو کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مُہر لگا دی ہے اور یہ لوگ (انجام سے) بالکل غافل ہیں (اس لئے) لازمی بات ہو کہ آخرت میں یہ لوگ بالکل گھاٹے میں رہیں گے۔

معارف ومسائل

مسئلہ: اس آیت سے ثابت ہوا کہ جس شخص کو کلمہ کفر کہنے پر اس طرح مجبور کر دیا گیا کہ اگر یہ کلمہ نہ کہے تو اس کو قتل کر دیا جائے، اور یہ بھی بظن غالب معلوم ہو کہ دھمکی دینے والے کو اس پر پوری قدرت حاصل ہے تو ایسے اکراہ کی حالت میں اگر وہ زبان سے کلمہ کفر کہہ دے، مگر اس کا دل ایمان پر جما ہوا ہو اور اس کلمہ کو باطل اور بُرا جانتا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور نہ اس کی بیوی اس پر حرام ہوگی (قرطبی ومظہری)

یہ آیت اُن صحابہ کرام کے بارے میں نازل ہوئی جن کو مشرکین نے گرفتار کر لیا تھا، اور کہا تھا کہ یا وہ کفر اختیار کریں ورنہ قتل کر دیئے جائیں گے۔

یہ گرفتار ہونے والے حضرات حضرت عمارؓ اور ان کے والدین یاسرؓ اور سمیہؓ اور صہیب اور بلالؓ اور خبابؓ رضی اللہ عنہم تھے، جن میں سے حضرت یاسرؓ اور ان کی زوجہ محترمہ سمیہؓ نے کلمہ کفر بولنے سے قطعی انکار کیا، حضرت یاسرؓ کو قتل کر دیا گیا، اور حضرت سمیہؓ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر ان کو دو ڑایا گیا جس سے اُن کے دو ٹکڑے الگ الگ ہو کر شہید ہوئیں، اور یہی دو بزرگ ہیں جن کو اسلام کی خاطر سب سے پہلے شہادت نصیب ہوئی، اسی طرح حضرت خبابؓ نے کلمہ کفر بولنے سے قطعی انکار کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ قتل کئے جانے کو قبول کیا، ان میں سے حضرت عمارؓ نے جان کے خوف سے زبانی اقرار کفر کا کر لیا، مگر دل ان کا ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، جب یہ دشمنوں سے رہائی پا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بڑے رنج وغم کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ جب تم یہ کلمہ بول رہے تھے تو تمہارے دل کا کیا حال تھا، انھوں نے عرض کیا کہ دل تو ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مطمئن

کیا کہ تم پر اس کا کوئی وبال نہیں، آپ کے اس فیصلہ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی (قرطبی ومظہری)

اکراہ کی تعریف وتحدید اکراہ کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو ایسے قول یا فعل پر مجبور کیا جائے جس کے کہنے یا کرنے پر وہ راضی نہیں، پھر اس کے دو درجے ہیں، ایک درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ دل سے تو اس پر آمادہ نہیں مگر ایسا بے اختیار و بے قابو بھی نہیں کہ انکار نہ کر سکے، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ غیر ملجیٔ کہلاتا ہے، ایسے اکراہ سے کوئی کلمہ کفر کہنا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا، البتہ بعض جزئی احکام میں اس پر بھی کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔

دوسرا درجہ اکراہ کا یہ ہے کہ وہ مسلوب الاختیار کر دیا جائے کہ اگر وہ اکراہ کرنے والوں کے کہنے پر عمل نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ ملجیٔ کہلاتا ہے جس کے معنی ہیں ایسا اکراہ جو انسان کو مسلوب الاختیار اور مجبور محض کر دے، ایسے اکراہ کی حالت میں کلمہ کفر کا زبان سے کہہ دینا بشرطیکہ قلب ایمان پر مطمئن ہو جائز ہے، اسی طرح دوسرے انسان کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی حرام فعل کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

مگر دونوں قسم کے اکراہ میں شرط یہ ہے کہ اکراہ کرنے والا جس کام کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس پر قادر بھی ہو اور جو شخص مبتلا ہے اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں اس کی بات نہ مانوں گا تو جس چیز کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس کو ضرور کر ڈالے گا (مظہری)

مسئلہ: معاملات دو قسم کے ہیں، ایک وہ جن میں دل سے رضامند ہونا ضروری ہے، جیسے خرید وفروخت وہبہ وغیرہ کہ ان میں دل سے رضامند ہونا معاملہ کے لئے شرط ہے بنص قرآن اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ، یعنی کسی دوسرے شخص کا مال حلال نہیں ہوتا جب تک تجارت وغیرہ کا معاملہ طرفین کی رضامندی سے نہ ہو" اور حدیث میں ہے:

لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ

"یعنی کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے اس کے دینے پر راضی نہ ہو"

ایسے معاملات اگر اکراہ کے ساتھ کرا لئے جائیں تو شرعاً ان کا کوئی اعتبار نہیں، اکراہ کی حالت سے نکلنے کے بعد اس کو اختیار ہوگا کہ بحالت اکراہ جو بیع یا ہبہ وغیرہ کیا تھا اس کو اپنی رضا سے باقی رکھے یا فسخ کر دے۔

اور کچھ معاملات ایسے بھی ہیں جن میں صرف زبان سے الفاظ کہہ دینے پر مدار ہے، دل

کا قصد و ارادہ یا رضاء و خوشی شرط معاملہ نہیں، مثلاً نکاح، طلاق، رجعت، عتاق وغیرہ، ایسے معاملاؔ کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے، ثلث جدّھن جدٌّ وھزلھن جدّ النکاح والطلاق والرجعۃ، رواہ ابوداؤد والترمذی وحسنہ یعنی اگر دو شخص زبان سے نکاح کا ایجاب وقبول شرائط کے مطابق کرلیں یا کوئی شوہر اپنی بیوی کو زبان سے طلاق دیدے، یا طلاق کے بعد زبان سے رجعت کرے، خواہ وہ بطور ہنسی مذاق کے ہو دل میں ارادہ نکاح یا طلاق یا رجعت کا نہ ہو پھر بھی محض الفاظ کے کہنے سے نکاح منعقد ہو جائے گا، اور طلاق پڑ جائے گی، نیز رجعت صحیح ہو جائے گی (مظہری)

امام اعظم ابوحنیفہ، شعبی، زہری، نخعی اور قتادہ رحمہم اللہ کے نزدیک طلاق مکرہ کا بھی یہی حکم ہے کہ حالتِ اکراہ میں اگرچہ وہ طلاق دینے پر دل سے آمادہ نہیں تھا مجبور ہو کر الفاظِ طلاق کہہ دیئے، اور وقوعِ طلاق کا تعلق صرف الفاظِ طلاق ادا کردینے سے ہے، دل کا قصد و ارادہ شرط نہیں، جیسا کہ حدیث مذکور سے ثابت ہے، اس لئے یہ طلاق واقع ہو جائے گی۔

مگر امام شافعی اور حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے نزدیک حالتِ اکراہ کی طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ حدیث میں ہے،

رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَآءُ وَالنِّسْیَانُ وَ مَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ، رواہ الطبرانی عن ثوبانؓ

"یعنی میری امت سے خطاء اور نسیان اور جس چیز پر ان کو مضطر و مجبور کردیا جائے سب اٹھا دیئے گئے ہیں"

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ حدیث احکامِ آخرت کے متعلق ہے، کہ خطاء یا نسیان سے یا اکراہ کی حالت میں جو کوئی قول وفعل شریعت کے خلاف کرلیا اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا، باقی رہے احکامِ دنیا اور وہ نتائج جو اس فعل پر مرتب ہو سکتے ہیں ان کا وقوع تو محسوس و مشاہد ہے، اور دنیا میں اس وقوع پر جو آثار و احکام مرتب ہوتے ہیں وہ ہو کر رہیں گے، مثلاً کسی نے کسی کو خطاءً قتل کردیا تو اس کو قتل کا گناہ اور آخرت کی سزا تو بے شک نہ ہوگی، مگر جس طرح قتل کا محسوس اثر مقتول کی جان کا چلا جانا واقع ہے اسی طرح اس کا یہ شرعی اثر بھی ثابت ہوگا کہ اس کی بیوی عدت کے بعد نکاحِ ثانی کرسکے گی، اس کا مال وراثت میں تقسیم ہو جائے گا، اسی طرح جب الفاظ طلاق یا نکاح یا رجعت زبان سے ادا کردیئے تو ان کا شرعی اثر بھی ثابت ہو جائے گا (مظہری وقرطبی) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ثُمَّ اِنَّ رَبَّکَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا

پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب ان لوگوں پر کہ انھوں نے وطن چھوڑا ہے بعد اس کے کہ مصیبت اٹھائی پھر جہاد کرتے

وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّکَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۰﴾ یَوْمَ تَاْتِیْ

رہے اور قائم رہے بیشک تیرا رب ان باتوں کے بعد بخشنے والا مہربان ہے، جس دن آئے گا

کُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ

ہر جی جواب سوال کرتا اپنی طرف سے اور پورا ملے گا ہر کسی کو جو اس نے کمایا اور ان پر

لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً کَانَتْ اٰمِنَةً

ظلم نہ ہوگا، اور بتلائی اللہ نے ایک مثال ایک بستی تھی، چین

مُّطْمَئِنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ فَکَفَرَتْ بِاَنْعُمِ

امن سے چلی آتی تھی اس کو روزی فراغت کی ہر جگہ سے پھر ناشکری کی اللہ کے

اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

احسانوں کی پھر چکھایا اس کو اللہ نے مزہ کہ ان کے تن کے کپڑے ہو گئے بھوک اور ڈر بدلہ اس کا جو وہ کرتے تھے،

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَکَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ

اور ان کے پاس پہنچ چکا رسول انہی میں کا پھر اس کو جھٹلایا پھر آپکڑا ان کو

الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

عذاب نے اور وہ گنہگار تھے۔

خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیات میں کفر پر وعید کا ذکر تھا، خواہ کفر اصلی ہو یا ارتداد کا کفر، اس کے بعد کی مذکورہ تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ایمان ایسی دولت ہے کہ جو کافر یا مرتد سچا ایمان لے آئے اس کے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

دوسری آیت میں قیامت کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ یہ جزاء و سزا سب قیامت کے بعد ہی ہونے والی ہے، تیسری آیت میں یہ بتلایا گیا کہ کفر و معاصی کی اصلی سزا تو قیامت کے بعد

ہی ملے گی، مگر بعض گناہوں کی سزا دنیا میں بھی کچھ مل جاتی ہے، تینوں آیتوں کی مختصر تفسیر یہ ہے:-

پھر (اگر کفر کے بعد یہ لوگ ایمان لے آویں تو) بیشک آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے کہ جنھوں نے مبتلاء کفر ہونے کے بعد (ایمان لاکر) ہجرت کی پھر جہاد کیا، اور (ایمان پر) قائم رہے تو آپ کا رب (ایسے لوگوں کے لئے) ان (اعمال) کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے (یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کی برکت سے سب پچھلے گناہ معاف ہو جاویں گے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان کو جنت میں بڑے بڑے درجے ملیں گے، کفر سے پہلے کے گناہ تو صرف ایمان سے معاف ہو جاتے ہیں، جہاد وغیرہ اعمال صالحہ شرط معافی نہیں، لیکن اعمالِ صالحہ درجاتِ جنت ملنے کے اسباب ہیں، اس لئے اس کے ساتھ ذکر کر دیا گیا) اور یہ جزاء و سزاء مذکور اس روز (واقع ہوگی) جس روز ہر شخص اپنی اپنی طرف داری میں گفتگو کرے گا (اور دوسروں کو نہ پوچھے گا) اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملے گا (یعنی نیکی کے بدلے میں کمی نہ ہوگی، گو اللہ کی رحمت سے زیادتی ہو جانے کا امکان ہے اور بدی کے بدلے میں زیادتی نہ ہوگی، ہاں یہ ممکن ہے کہ رحمت سے اس میں کچھ کمی ہو جاوے، یہی مطلب ہے اس کا کہ) ان پر ظلم نہ کیا جاوے گا (اس کے بعد یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ کفر و معصیت کی پوری سزا حشر کے بعد ہوگی، مگر کبھی دنیا میں بھی اس کا وبال عذاب کی صورت میں آجاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ ایک بستی والوں کی حالتِ عجیبہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ (بڑے) امن و اطمینان میں رہتے تھے (اور) ان کے کھانے پینے پہننے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر چہار طرف سے ان کے پاس پہونچا کرتی تھیں (ان لوگوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا بلکہ) انھوں نے خدا کی نعمتوں کی بے قدری کی (یعنی کفر و شرک اور معصیت میں مبتلا ہو گئے) اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو ان کی حرکتوں کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا (کہ مال و دولت کی فراوانی سلب ہو کر قحط اور بھوک میں مبتلا ہو گئے، اور دشمنوں کا خوف مسلط کر کے ان کی بستیوں کا امن و اطمینان بھی سلب کر لیا) اور (اس سزا میں حق تعالیٰ کی طرف سے کچھ جلدی نہیں کی گئی بلکہ اول اس کی تنبیہ و اصلاح کے واسطے) ان کے پاس انہی میں کا ایک رسول بھی (منجانب اللہ) آیا (جس کے صدق و دیانت کا حال خود اپنی قوم میں ہونے کی وجہ سے ان کو پوری طرح معلوم تھا) سو اس (رسول) کو (بھی) انھوں نے جھوٹا بتایا تب ان کو عذاب نے آپکڑا جب کہ وہ بالکل ہی ظلم پر کمر باندھنے لگے۔

معارف و مسائل

آخری آیت میں بھوک اور خوف کا مزہ چکھانے کے لئے لفظ لباس استعمال فرمایا کہ لباس بھوک اور خوف کا ان کو چکھایا گیا، حالانکہ لباس چکھنے کی چیز نہیں، مگر یہاں لباس کا لفظ محیط اور ہمہ گیر ہونے کے لئے تشبیہاً استعمال ہوا ہے، کہ یہ بھوک اور خوف اُن سب کے سب پر ایسا چھا گیا کہ جس طرح لباس بدن کے ساتھ لازم ملزوم ہو جاتا ہے، یہ بھوک اور خوف بھی ان پر اسی طرح مسلط کر دیئے گئے۔

یہ مثال جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے بعض ائمہ تفسیر کے نزدیک تو عام مثال ہے، کسی خاص بستی سے اس کا تعلق نہیں، اور اکثر حضرات نے اس کو مکہ مکرمہ کا واقعہ قرار دیا کہ وہ سات سال تک شدید قحط میں مبتلا رہے، کہ مردار جانور اور کتے اور غلاظتیں کھانے پر مجبور ہو گئے، اور مسلمانوں کا خوف اُن پر مسلط ہو گیا، پھر مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کفر و نافرمانی کے قصوروار تو مرد ہیں، عورتیں، بچے تو بے قصور ہیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے مدینہ طیبہ سے کھانے وغیرہ کا سامان بھجوا دیا۔ (مظہری)

اور ابوسفیان نے بحالتِ کفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ تو صلہ رحمی اور عفو و درگذر کی تعلیم دیتے ہیں، یہ آپ کی قوم ہلاک ہوئی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعاء کیجئے کہ یہ قحط ہم سے دور ہو جاوے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے دعاء فرمائی اور قحط ختم ہوا (قرطبی)

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ

سو کھاؤ جو روزی دی تم کو اللہ نے حلال اور پاک، اور شکر کرو اللہ کے احسان کا

اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١١٤﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ

اگر تم اسی کو پوجتے ہو، اللہ نے تو یہی حرام کیا ہے تم پر مُردار اور

الدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ

لہو اور سُور کا گوشت اور جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی ناچار ہو جا

غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٥﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا

نہ زور کرتا ہو نہ زیادتی تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے، اور مت کہو اپنی زبانوں کے

تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا

جھوٹ بنا لینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ اللہ پر

عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

بہتان باندھو، بیشک جو بہتان باندھتے ہیں اللہ پر ان کا

لَا يُفْلِحُوْنَ ۝۱۱۷ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۱۸ وَعَلَى

بھلا نہ ہوگا، تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں، اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے، اور جو

الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا

لوگ یہودی ہیں ان پر حرام کیا تھا جو تجھ کو پہلے سنا چکے، اور ہم نے

ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۱۱۸ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ

ان پر ظلم نہیں کیا پر وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے تھے، پھر بات یہ ہے کہ تیرا رب

لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ

ان لوگوں پر جنھوں نے برائی کی نادانی سے پھر توبہ کی اس کے پیچھے اور

اَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۱۹

سنوارا اپنے آپ کو، سو تیرا رب ان باتوں کے پیچھے بخشنے والا مہربان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

پچھلی آیت میں اللہ جل شانہٗ کی نعمتوں پر کفار کی ناشکری اور اس کے عذاب کا ذکر تھا، مذکورہ آیات میں اوّل تو مسلمانوں کو اس کی ہدایت کی گئی کہ وہ ناشکری نہ کریں، اللہ تعالیٰ نے جو حلال نعمتیں ان کو دی ہیں ان کو شکر کے ساتھ استعمال کریں، اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ کفار و مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی ایک خاص صورت یہ بھی اختیار کر رکھی تھی کہ بہت سی چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے حلال کیا تھا، اپنی طرف سے ان کو حرام کہنے لگے، اور بہت سی چیزیں جن کو اللہ نے حرام کہا تھا ان کو حلال کہنے لگے، مسلمانوں کو اس پر تنبیہ فرمائی کہ وہ ایسا نہ کریں، کسی چیز کا حلال یا حرام کرنا صرف اس ذات کا حق ہے جس نے انکو پیدا کیا ہے اپنی طرف سے ایسا کرنا خدائی اختیارات میں دخل دینا اور اللہ تعالیٰ پر افترا کرنا ہے

آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جن لوگوں نے جہالت سے اس طرح کے جرائم کئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اگر وہ توبہ کرلیں اور صحیح ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ سب گناہ بخش دیں گے، مختصر تفسیر آیات کی یہ ہے:۔

سو جو چیزیں تم کو اللہ نے حلال اور پاک دی ہیں ان کو (حرام نہ سمجھو کہ یہ مشرکین کی جاہلانہ رسم ہے بلکہ) ان کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر کرو اگر تم (اپنے دعوے کے مطابق) اسی کی عبادت کرتے ہو، تم پر تو (منجملہ اُن چیزوں کے جن کو تم حرام کہتے ہو، اللہ تعالیٰ نے) صرف مُردار کو حرام کیا ہے، اور خون کو اور خنزیر کے گوشت (وغیرہ) کو اور جس چیز کو غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر جو شخص کہ (مارے فاقہ کے) بالکل بے قرار ہو جائے، بشرطیکہ طالبِ لذت نہ ہو، اور نہ حد (ضرورت) سے تجاوز کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ (اس کے لئے اگر وہ ان چیزوں کو کھالے) بخش دینے والا مہربانی کرنے والا ہے، اور جن چیزوں کے متعلق محض تمھارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے، (اور اس پر کوئی دلیل صحیح قائم نہیں) اُن کے متعلق یوں نہ کہہ دیا کرو کہ فلاں چیز حلال اور فلاں حرام ہے (جیسا کہ پارۂ ہشتم کے ربع کے قریب آیات وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ میں ان کے ایسے جھوٹے دعوے آچکے ہیں) جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگاؤ گے (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو ایسا نہیں کہا، بلکہ اس کے خلاف فرمایا ہے) بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں وہ فلاح نہ پائیں گے، (خواہ دنیا و آخرت دونوں میں یا صرف آخرت میں) یہ (دنیا میں) چند روزہ عیش ہے (اور آگے مرنے کے بعد) اُن کے لئے دردناک سزا ہے اور (یہ مشرکین ملّتِ ابراہیمی کے متبع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کی شریعت میں تو یہ چیزیں حرام نہ تھیں، جن کو انھوں نے حرام قرار دیدیا ہے، البتہ بہت زمانے کے بعد اُن اشیاء میں سے) صرف یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کردی تھیں جن کا بیان ہم اس کے قبل (سورۂ انعام میں) آپ سے کر چکے ہیں (اور ان کی تحریم میں بھی) ہم نے اُن پر (صورۃً بھی) کوئی زیادتی نہیں کی لیکن وہ خود ہی اپنے اوپر (انبیاء کی مخالفت کرکے) زیادتی کیا کرتے تھے (تو معلوم ہوا کہ اشیاء طیبہ کو بالقصد تو کبھی حرام نہیں کیا گیا اور شریعتِ ابراہیمی میں کسی وقتی ضرورت کی وجہ سے بھی نہیں ہوئی پھر یہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا)۔

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنھوں نے جہالت سے بُرا کام (خواہ کچھ بھی ہو) کرلیا پھر اس کے بعد توبہ کرلی اور (آئندہ کے لئے) اپنے اعمال درست کرلئے تو آپ کا رب اس کے بعد بڑی مغفرت کرنے والا بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

معارف و مسائل

محرماتِ مذکورہ میں حصر اضافی ہے حقیقی نہیں

اس آیت میں لفظ اِنَّمَا سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیزیں صرف یہی چار ہیں جو آیت میں مذکور ہیں، اور اس سے زیادہ صحیح طور پر آیت قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا الآیۃ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے سوا کوئی چیز حرام نہیں، حالانکہ قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق باجماعِ امت اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں، اس اشکال کا جواب خود انہی آیات کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس جگہ عام حرام وحلال کا بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ مشرکینِ جاہلیت نے جو بہت سی چیزوں کو اپنی طرف سے حرام کر لیا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی حرمت کا حکم نہیں دیا تھا ان کا بیان کرنا مقصود ہے، کہ تمہاری حرام کردہ اشیاء میں سے اللہ کے نزدیک صرف یہی چیزیں حرام ہیں، اس آیت کی مکمل تفسیر اور ان چاروں محرمات کے احکام کا مفصل بیان سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۷۳ میں "معارف القرآن" جلد اوّل صفحہ ۳۵۸ سے صفحہ ۳۷۰ تک آچکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

توبہ سے گناہ کی معافی عام ہے خواہ بے سمجھی سے کرے یا جان بوجھ کر

آیت ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ میں لفظ جہل نہیں بلکہ جہالت استعمال فرمایا ہے، جہل تو علم کے بالمقابل آتا ہے اور بے علمی بے سمجھی کے معنی میں ہے، اور جہالت کا لفظ جاہلانہ حرکت کے لئے بولا جاتا ہے، اگرچہ جان بوجھ کر کرے، اس سے معلوم ہوگیا کہ توبہ سے گناہ کی معافی بے سمجھی یا بے اختیاری کے ساتھ مقید نہیں۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ

اصل میں ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا فرمانبردار اللہ کا سب سے ایک طرف ہو کر، اور نہ تھا شرک

الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۲۰ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ۭ اجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ

کرنے والوں میں، حق ماننے والا اس کے احسانوں کا، اس کو اللہ نے چن لیا اور چلایا سیدھی

مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۲۱ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ

راہ پر، اور دی ہم نے دنیا میں اس کو خوبی اور وہ آخرت میں

لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۲۲ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ

اچھے لوگوں میں ہے، پھر حکم بھیجا تجھ کو ہم نے کہ چل دین ابراہیم پر جو ایک طرف کا تھا

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۲۳ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَي الَّذِيْنَ

اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں، ہفتہ کا دن جو مقرر کیا سو انہی پر جو اس

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا

میں اختلاف کرتے تھے، اور تیرا رب حکم کرے گا ان میں قیامت کے دن جس بات میں

فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۲۴	
اختلاف کرتے تھے۔	

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات

پچھلی آیات میں اصولِ شرک وکفر یعنی انکارِ توحید وانکارِ رسالت پر رد اور کفر وشرک کے بعض فروع، یعنی تحلیلِ حرام اور تحریمِ حلال پر رد وابطال کی تفصیل تھی، اور مشرکینِ مکہ جو قرآن کریم کے پہلے اور بلاواسطہ مخاطب تھے، اپنے کفر وبت پرستی کے باوجود دعویٰ یہ کرتے تھے کہ ہم ملتِ ابراہیمی کے پابند ہیں، اور ہم جو کچھ کرتے ہیں یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات ہیں؛ اس لئے مذکورہ چار آیتوں میں ان کے اس دعوے کی تردید اور انہی کے مسلمات سے ان کے جاہلانہ خیالات کا ابطال اس طرح کیا گیا کہ مذکورہ پانچ آیتوں میں سے پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تمام اقوام عالم کا مسلّم مقتدا ہونا بیان فرمایا، جو نبوت ورسالت کا اعلیٰ مقام ہے، اس سے ان کا عظیم الشان نبی ورسول ہونا ثابت ہوا، اس کے ساتھ ہی مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ سے ان کا کامل توحید پر ہونا بیان فرمایا۔

اور دوسری آیت میں ان کا شکر گذار اور صراطِ مستقیم پر ہونا بیان فرما کر ان کو تنبیہ کی کہ تم اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتے ہوئے اپنے کو ان کا متبع کس زبان سے کہتے ہو؟

تیسری آیت میں ان کا دنیا وآخرت میں کامیاب وبامراد ہونا اور چوتھی آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے اثبات کے ساتھ آپ کا صحیح ملتِ ابراہیم کا پابند ہونا بیان فرما کر یہ ہدایت کی گئی کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور آپ کی اطاعت کے بغیر یہ دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا۔

پانچویں آیت اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ میں اشارۃً یہ بیان فرمایا کہ ملّتِ ابراہیمی میں اشیاء طیبہ حرام نہیں تھیں، جن کو تم نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا ہے، مختصر تفسیر آیاتِ مذکورہ کی یہ ہے:۔

بیشک ابراہیم (علیہ السلام جن کو تم بھی مانتے ہو) بڑے مقتدا، (یعنی نبی اولوالعزم اور اُمّتِ عظیمہ کے متبوع و مقتدا) اللہ تعالیٰ کے (پورے) فرمانبردار تھے (ان کا کوئی عقیدہ یا عمل اپنی خواہش نفسانی سے نہ تھا، پھر تم اس کے خلاف محض اپنے نفس کی پیروی سے اللہ کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیوں ٹھہراتے ہو، اور وہ) بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے، (اور مطلب ایک طرف ہونے کا یہ ہے کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تو پھر تم شرک کیسے کرتے ہو اور وہ) اللہ کی نعمتوں کے (بڑے) شکر گذار تھے (پھر تم شرک و کفر میں مبتلا ہو کر ناشکری کیوں کرتے ہو، غرض ابراہیم علیہ السلام کی یہ شان اور طریقہ تھا اور وہ ایسے مقبول تھے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب کر لیا تھا اور ان کو سیدھے راہ پر ڈال دیا تھا، اور ہم ان کو دنیا میں بھی خوبیاں (مثل نبوت و رسالت میں منتخب ہونا اور ہدایت پر ہونا وغیرہ) دی تھیں اور وہ آخرت میں بھی (اعلیٰ درجہ کے) اچھے لوگوں میں ہوں گے (اس لئے تم سب کو انہی کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، اور وہ طریقہ اب منحصر ہے طریقہ محمدیہ میں، جس کا بیان یہ ہے کہ) پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقہ پر جو کہ بالکل ایک (خدا) کی طرف ہو رہے تھے چلئے (اور چونکہ اس زمانہ کے وہ لوگ جو ملّتِ ابراہیمی کے اتباع کے مدعی تھے کچھ نہ کچھ شرک میں مبتلا تھے، اس لئے مکرر فرمایا کہ) وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے (تاکہ بت پرستوں کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے موجودہ طریقہ پر بھی رد ہو جائے جو شرک سے خالی نہیں، اور چونکہ یہ لوگ تحریم طیبات کی جاہلانہ و مشرکانہ رسوم میں مبتلا تھے، اس لئے فرمایا کہ) بس ہفتہ کی تعظیم (یعنی ہفتہ کے روز مچھلی کے شکار کی ممانعت جو تحریم طیبات کی ایک فرد ہے وہ تو) صرف انہی لوگوں پر لازم کی گئی تھی جنھوں نے اس میں (عملاً) خلاف کیا تھا (کہ کسی نے ماننا اور عمل کیا، کسی نے اس کے خلاف کیا، مراد اس سے یہود ہیں، کہ تحریم طیبات کی یہ صورت مثل دوسری صورتوں کے صرف یہود کے ساتھ مخصوص تھی، ملّتِ ابراہیمی میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں، آگے احکام الٰہیہ میں اختلاف کرنے کے متعلق فرماتے ہیں کہ) بیشک آپ کا رب قیامت کے دن ان میں باہم (عملاً) فیصلہ کر دے گا جس بات میں یہ (دنیا میں) اختلاف کیا کرتے تھے۔

معارف و مسائل

لفظ اُمّت چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، مشہور معنی جماعت اور قوم کے ہیں،

حضرت ابن عباسؓ سے اس جگہ یہی معنی منقول ہیں، اور مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تنہا ایک فرد ایک اُمّت اور قوم کے کمالات و فضائل کے جامع ہیں، اور ایک معنی لفظ امّت کے مقتدائے قوم اور جامع کمالات کے بھی آتے ہیں، بعض مفسرین نے اس جگہ یہی معنی لئے ہیں اور قانت کے معنی تابع فرمان کے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں وصفوں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں مقتدا ہونے کا تو یہ عالم ہے کہ پوری دنیا کے تمام مشہور مذاہب کے لوگ سب آپ پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور آپ کی ملّت کے اتباع کو عزت و فخر جانتے ہیں، یہود، نصاریٰ، مسلمان تو ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہی ہیں، مشرکین عرب بت پرستی کے باوجود اس بت شکن کے معتقد اور ان کی ملّت پر چلنے کو اپنا فخر جانتے ہیں، اور قانت و مطیع ہونے کا خاص امتیاز ان امتحانات سے واضح ہو جاتا ہے جن سے اللہ کے یہ خلیل گذرے ہیں، آتشِ نمرود، اہل و عیال کو لق و دق جنگل میں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم، پھر آرزوؤں سے حاصل ہونے والے بیٹے کی قربانی پر آمادگی یہ سب وہ امتیازات ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان القاب سے معزز فرمایا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ملّتِ ابراہیمی کا اتباع

حق تعالیٰ نے جو شریعت و احکام حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت بھی بعض خاص احکام کے علاوہ اس کے مطابق رکھی گئی، اور اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء و رسل سے افضل ہیں، مگر یہاں افضل کو مفضول کے اتباع کا حکم دینے میں دو حکمتیں ہیں، اوّل تو یہ کہ وہ شریعت پہلے دنیا میں آچکی ہے، اور معلوم و معروف ہو چکی ہے، آخری شریعت بھی چونکہ اس کے مطابق ہونے والی تھی، اس لئے اس کو اتباع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسرے بقول علامہ زمخشری یہ حکم اتباع بھی جملہ اکرام و اعزاز خلیل اللہ کے ایک خاص اعزاز ہے، اور اس کی خصوصیت کی طرف لفظ ثُمَّ سے اشارہ کر دیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے تمام فضائل و کمالات ایک طرف اور ان سب پر فائق یہ کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے افضل رسول و حبیب کو ان کی ملّت کے اتباع کا حکم فرمایا۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم

بلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر اور نصیحت سنا کر بھلی طرح اور الزام

بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ

دے ان کو جس طرح بہتر ہو تیرا رب ہی بہتر جانتا ہے ان کو جو بھول گیا اس کی راہ سے

وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۱۲۵﴾ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ

اور وہی بہتر جانتا ہے اُن کو جو راہ پر ہیں ، اور اگر بدلہ لو تو بدلہ لو اسی قدر جس قدر کہ تم کو تکلیف

بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ﴿۱۲۶﴾ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ

پہنچائی جائے ، اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کو ، اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے

إِلَّا بِاللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ﴿۱۲۷﴾

اللہ ہی کی مدد سے اور نہ اُن پر غم کھا اور تنگ مت ہو ان کے فریب سے ،

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ﴿۱۲۸﴾

اللہ ساتھ ہے اُن کے جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکی کرتے ہیں ۔

خلاصۂ تفسیر

ربطِ آیات سابقہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اثبات سے مقصود یہ تھا کہ اُمت آپ کے احکام کی تعمیل کرکے رسالت کے حقوق ادا کریں، مذکورہ آیات میں خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ادائے رسالت کے حقوق اور آداب کی تعلیم ہے، جس کے عموم میں تمام مؤمنین شریک ہیں، مختصر تفسیر یہ ہے:-

آپ اپنے رب کی راہ (یعنی دین اسلام) کی طرف (لوگوں کو) حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ بلائیے (حکمت سے وہ طریقۂ دعوت مراد ہے جس میں مخاطب کے احوال کی رعایت سے ایسی تدبیر اختیار کی گئی ہو جو مخاطب کے دل پر اثر انداز ہو سکے، اور نصیحت سے مراد یہ ہے کہ خیر خواہی و ہمدردی کے جذبہ سے بات کہی جائے، اور اچھی نصیحت سے مراد یہ ہے کہ عنوان بھی نرم ہو، دل خراش توہین آمیز نہ ہو) اور اُن کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کیجئے (یعنی اگر بحث مباحثے کی نوبت آجائے تو وہ بھی شدت اور خشونت سے اور مخاطب پر الزام تراشی اور بے انصافی سے خالی ہونا چاہئے، بس اتنا کام آپ کا ہے، پھر اس تحقیق میں نہ پڑیئے کہ کس نے مانا کس نے نہیں مانا، یہ کام خدا تعالیٰ کا ہے پس) آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اس کے راستہ سے گم ہو گیا اور وہی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے اور (اگر کبھی مخاطب علمی بحث و مباحثہ کی حد سے آگے بڑھ کر عملی جدال اور ہاتھ یا زبان سے ایذاء پہنچانے لگیں تو اس میں آپ کو اور آپ کے متبعین کو بدلہ لینا بھی جائز ہے اور صبر کرنا بھی پس اگر (پہلی صورت اختیار کرو یعنی)

بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے (اس سے زیادتی نہ کرو) اور اگر (دوسری صورت یعنی ایذاؤں پر) صبر کرو تو وہ (صبر کرنا) صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے (کہ مخالف پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے اور دیکھنے والوں پر بھی اور آخرت میں موجب اجرِ عظیم ہے) اور (صبر کرنا اگرچہ سبھی کے لئے بہتر ہے، مگر آپ کی عظمتِ شان کے لحاظ سے آپ کو خصوصیت کے ساتھ حکم ہے کہ آپ انتقام کی صورت اختیار نہ کریں بلکہ) آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خدا ہی کی توفیق خاص سے ہے (اس لئے آپ اطمینان رکھیں کہ صبر میں آپ کو دشواری نہ ہوگی) اور ان لوگوں (یعنی ان کے ایمان نہ لانے پر یا مسلمانوں کو ستانے) پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ یہ تدبیریں کیا کرتے ہیں اس سے تنگدل نہ ہو جئے (ان کی مخالف تدبیروں سے آپ کا کوئی ضرر نہ ہوگا، کیونکہ آپ کو احسان اور تقویٰ کی صفات حاصل ہیں اور) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے (یعنی ان کا مددگار ہوتا ہے) جو پرہیزگار ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں ۔

معارف و مسائل

دعوت و تبلیغ کے اصول اور مکمل نصاب اس آیت میں دعوت و تبلیغ کا مکمل نصاب، اس کے اصول اور آداب کی پوری تفصیل چند کلمات میں سموئی ہوئی ہے، تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت ہرم ابن حیانؒ کی موت کا وقت آیا تو عزیزوں نے درخواست کی کہ ہمیں کچھ وصیت فرمائیے، تو فرمایا کہ وصیت تو لوگ اموال کی کیا کرتے ہیں وہ میرے پاس ہے نہیں، لیکن میں تم کو اللہ کی آیات خصوصاً سورۂ نحل کی آخری آیتوں کی وصیت کرتا ہوں، کہ ان پر مضبوطی سے قائم رہو، وہ آیات یہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئیں۔

دعوۃ کے لفظی معنی بلانے کے ہیں، انبیاء علیہم السلام کا پہلا فرض منصبی لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے، پھر تمام تعلیماتِ نبوت و رسالت اسی دعوت کی تشریحات ہیں، قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفت داعی الی اللہ ہونا ہے، وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا (احزاب ۴۶) يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ (احقاف ۳۱)

اُمت پر بھی آپ کے نقشِ قدم پر دعوت الی اللہ کو فرض کیا گیا ہے، سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ	تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا چاہئے
إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	جو لوگوں کو خیر کی طرف دعوتِ دین (یعنی)
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران ۱۰۴)	نیک کاموں کا حکم کریں اور بُرے کاموں سے

اور ایک آیت میں ارشاد ہے :-

وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ	"گفتار کے اعتبار سے اس شخص سے اچھا کون ہوسکتا ہو جس نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلایا"

تعبیر میں کبھی اس لفظ کو دعوت الی اللہ کا عنوان دیا جاتا ہے، اور کبھی دعوت الی الخیر کا اور کبھی دعوت الی سبیل اللہ کا، حاصل سب کا ایک ہی ہے، کیونکہ اللہ کی طرف بلانے سے اس کے دین اور صراط مستقیم ہی کی طرف بلانا مقصود ہے۔

اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ ، اس میں اللہ جل شانہٗ کی خاص صفت رَبّ، اور پھر اس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اضافت میں اشارہ ہے کہ دعوت کا کام صفتِ ربوبیت اور تربیت سے تعلق رکھتا ہے، جس طرح حق تعالیٰ جل شانہٗ نے آپ کی تربیت فرمائی، آپ کو بھی تربیت کے انداز سے دعوت دینا چاہئے، جس میں مخاطب کے حالات کی رعایت کرکے وہ طرز اختیار کیا جائے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، اور اس کی تاثیر زیادہ سے زیادہ ہو، خود لفظ دعوت بھی اس مفہوم کو ادا کرتا ہے کہ پیغمبر کا کام صرف اللہ کے احکام پہونچا دینا اور سنا دینا نہیں بلکہ لوگوں کو ان کی تعمیل کی طرف دعوت دینا ہے، اور ظاہر ہے کہ کسی کو دعوت دینے والا اس کے ساتھ ایسا خطاب نہیں کیا کرتا، جس سے مخاطب کو وحشت و نفرت ہو یا جس میں اس کے ساتھ استہزاء و تمسخر کیا گیا ہو۔

بِالۡحِكۡمَةِ ، لفظ حکمت قرآن کریم میں بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے، اس جگہ بعض ائمہ تفسیر نے حکمت سے مراد قرآن کریم، بعض نے قرآن و سنت، بعض نے حجتِ قطعیہ قرار دیا ہے، اور روح المعانی نے بحوالہ بحر محیط حکمت کی تفسیر یہ کی ہے :

انها الكلام الصواب الواقع من النفس اجمل موقع (…)	"یعنی حکمت اس درست کلام کا نام ہے جو انسان کے دل میں اتر جائے"

اس تفسیر میں تمام اقوال جمع ہوجاتے ہیں، اور صاحبِ روح البیان نے بھی تقریباً یہی مطلب ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ "حکمت سے مراد وہ بصیرت ہے جس کے ذریعہ انسان مقتضیاتِ احوال کو معلوم کرکے اس کے مناسب کلام کرے، وقت اور موقع ایسا تلاش کرے کہ مخاطب پر بار نہ ہو، نرمی کی جگہ نرمی اور سختی کی جگہ سختی اختیار کرے، اور جہاں یہ سمجھے کہ صراحۃً کہنے میں مخاطب کو شرمندگی ہوگی، وہاں اشارات سے کلام کرے، یا کوئی ایسا عنوان اختیار کرے کہ مخاطب کو نہ شرمندگی ہو اور نہ اس کے دل میں اپنے خیال پر جمنے کا تعصب پیدا ہو۔

اَلۡمَوۡعِظَةُ ، موعظۃ اور وعظ کے لغوی معنی یہ ہیں کہ کسی خیر خواہی کی بات کو ایسی طرح کہا جائے کہ اس سے مخاطب کا دل قبولیت کے لئے نرم ہوجائے، مثلاً اس کے ساتھ قبول کرنے کے ثواب و فوائد اور نہ کرنے کے عذاب و مفاسد ذکر کئے جائیں (قاموس و مفرداتِ راغب)

اَلۡحَسَنَةُ کے معنی یہ ہیں کہ بیان اور عنوان بھی ایسا ہو جس سے مخاطب کا قلب مطمئن ہو، اس کے شکوک و شبہات دور ہوں، اور مخاطب یہ محسوس کرے کہ آپ کی اس میں کوئی غرض نہیں صرف اس کی خیر خواہی کے لئے کہہ رہے ہیں۔

مَوۡعِظَةُ کے لفظ سے خیر خواہی کی بات مؤثر انداز میں کہنا تو واضح ہوگیا تھا، مگر خیر خواہی کی بات بعض اوقات دل خراش عنوان سے یا اس طرح بھی کہی جاتی ہے جس سے مخاطب اپنی اہانت محسوس کرے (روح المعانی)، اس طریقہ کو چھوڑنے کے لئے لفظ حسنۃ کا اضافہ کردیا گیا۔

وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ، لفظ جادِل، مجادلہ سے مشتق ہے، اس جگہ مجادلہ سے مراد بحث و مناظرہ ہے، اور بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ سے مراد یہ ہے کہ اگر دعوت میں کہیں بحث و مناظرہ کی ضرورت پیش آجائے تو وہ مباحثہ بھی اچھے طریقہ سے ہونا چاہئے، روح المعانی میں ہے کہ اچھے طریقہ سے یہ مراد ہے کہ گفتگو میں لطف اور نرمی اختیار کی جائے، دلائل ایسے پیش کئے جائیں جو مخاطب آسانی سے سمجھ سکے، دلیل میں وہ مقدمات پیش کئے جائیں جو مشہور و معروف ہوں تاکہ مخاطب کے شکوک دور ہوں، اور وہ ہٹ دھرمی کے رستہ پر نہ پڑجائے، اور قرآن کریم کی دوسری آیات اس پر شاہد ہیں کہ یہ احسان فی المجادلہ صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، اہل کتاب کے بارے میں تو خصوصیت کے ساتھ قرآن کا ارشاد ہے، وَلَا تُجَادِلُوۡۤا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ، اور دوسری آیت میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو قَوۡلًا لَّهٗ قَوۡلًا لَّيِّنًا کی ہدایت دے کر یہ بھی بتلا دیا کہ فرعون جیسے سرکش کافر کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنا ہے۔

دعوت کے اصول و آداب

آیت مذکورہ میں دعوت کے لئے تین چیزوں کا ذکر ہے۔ اول حکمت، دوسرے موعظہ حسنہ، تیسرے مجادلہ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ، بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ تین چیزیں مخاطبین کی تین قسموں کی بناء پر ہیں، دعوت بالحکمۃ، اہل علم و فہم کے لئے، دعوت بالموعظۃ، عوام کے لئے، مجادلہ ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں شکوک و شبہات ہوں، یا جو عناد اور ہٹ دھرمی کے سبب بات ماننے سے منکر ہوں۔

سیدی حضرت حکیم الامۃ تھانوی نے بیان القرآن میں فرمایا کہ ان تین چیزوں کے مخاطب الگ الگ تین قسم کی جماعتیں ہونا سیاقِ آیت کے لحاظ سے بعید معلوم ہوتا ہے، انتہی،

ظاہر یہ ہے کہ یہ آداب دعوت ہر ایک کے لئے استعمال کرنے ہیں، کہ دعوت میں سب سے پہلے حکمت سے مخاطب کے حالات کا جائزہ لے کر اس کے مناسب کلام تجویز کرنا ہے، پھر اس کلام میں خیر خواہی و ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ایسے شواہد اور دلائل سامنے لانا ہے جن سے مخاطب مطمئن ہو سکے، اور طرز بیان و کلام ایسا مشفقانہ اور نرم رکھنا ہے کہ مخاطب کو اس کا یقین ہو جائے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں میری ہی مصلحت اور خیر خواہی کے لئے کہہ رہے ہیں، مجھے شرمندہ کرنا یا میری حیثیت کو مجروح کرنا ان کا مقصد نہیں۔

البتہ صاحب روح المعانی نے اس جگہ ایک نہایت لطیف نکتہ یہ بیان فرمایا کہ آیت کے نسق سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ دعوت اصل میں دو ہی چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، تیسری چیز مجادلہ، اصولِ دعوت میں داخل نہیں، ہاں طریق دعوت میں کبھی اس کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے۔

صاحب روح المعانی کا استدلال اس پر یہ ہے کہ اگر یہ تینوں چیزیں اصولِ دعوت ہوتیں تو مقتضائے مقام یہ تھا کہ تینوں چیزوں کو عطف کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاتا، بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ والجدال الاحسن، مگر قرآن حکیم نے حکمت و موعظت کو تو عطف کے ساتھ ایک ہی نسق میں بیان فرمایا اور مجادلہ کے لئے الگ جملہ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اختیار کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ فی العلم در اصل دعوت الی اللہ کا رکن یا شرط نہیں، بلکہ طریق دعوت میں پیش آنے والے معاملات کے متعلق ایک ہدایت ہے، جیسا کہ اس کے بعد کی آیت میں صبر کی تلقین فرمائی ہے، کیونکہ طریق دعوت میں لوگوں کی ایذاؤں پر صبر کرنا ناگزیر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصولِ دعوت دو چیزیں ہیں، حکمت اور موعظت، جن سے کوئی دعوت خالی نہ ہونا چاہئے، خواہ علماء و خواص کو ہو یا عوام الناس کو، البتہ دعوت میں کسی وقت ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑ جاتا ہے جو شکوک و اوہام میں مبتلا اور داعی کے ساتھ بحث مباحثہ پر آمادہ ہیں تو ایسی حالت میں مجادلہ کی تعلیم دی گئی، مگر اس کے ساتھ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ کی قید لگا کر بتلا دیا کہ جو مجادلہ اس شرط سے خالی ہو اس کی شریعت میں کوئی حیثیت نہیں۔

دعوت الی اللہ کے پیغمبرانہ آداب

دعوت الی اللہ در اصل انبیاء علیہم السلام کا منصب ہے، اُمت کے علماء اس منصب کو ان کا نائب ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں، تو لازم یہ ہے کہ اس کے آداب اور طریقے بھی انہی سے سیکھیں، جو دعوت اُن طریقوں پر نہ رہی وہ دعوت کے بجائے عداوت اور جنگ و جدال کا موجب ہو جاتی ہے۔

دعوت پیغمبرانہ کے اصول میں جو ہدایت قرآن کریم میں حضرت موسیٰ و ہارون کے لئے نقل کی گئی ہے کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى "یعنی فرعون سے نرم بات کرو شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے" یہ ہر داعی حق کو ہر وقت سامنے رکھنا ضروری ہے کہ فرعون جیسا سرکش کافر جس کی موت بھی علم الٰہی میں کفر ہی پر ہونے والی تھی اس کی طرف بھی جب اللہ تعالیٰ اپنے داعی کو بھیجتے ہیں تو نرم گفتار کی ہدایت کے ساتھ بھیجتے ہیں، آج ہم جن لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ فرعون سے زیادہ گمراہ نہیں، اور ہم میں سے کوئی موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے برابر ہادی و داعی نہیں، تو جو حق اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں پیغمبروں کو نہیں دیا کہ مخاطب سے سخت کلامی کریں اس پر فتوے کسیں، اس کی توہین کریں، وہ حق ہمیں کہاں سے حاصل ہو گیا۔

قرآن کریم انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ اور کفار کے مجادلات سے بھرا ہوا ہے، اس میں کہیں نظر نہیں آتا کہ کسی اللہ کے رسول نے حق کے خلاف ان پر طعنہ زنی کرنے والوں کے جواب میں کوئی ثقیل کلمہ بھی بولا ہو، اس کی چند مثالیں دیکھئے:۔

سورۂ اعراف کے ساتویں رکوع میں آیات ۵۹ سے ۶۷ تک دو پیغمبر حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کے ساتھ ان کی قوم کے مجادلے اور سخت سست الزامات کے جواب میں ان بزرگوں کے کلمات قابلِ ملاحظہ ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے وہ اولوالعزم پیغمبر ہیں جن کی طولِ عمر دنیا میں مشہور ہے، ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کی دعوت و تبلیغ، اصلاح و ارشاد میں دن رات مشغول رہے، مگر اس بدبخت قوم میں سے معدودے چند کے علاوہ کسی نے ان کی بات نہ مانی، اور تو اور خود ان کا ایک لڑکا اور بیوی کافروں کے ساتھ لگے رہے، ان کی جگہ آج کا کوئی مدعی دعوت و اصلاح ہوتا تو اس قوم کے ساتھ اس کا لب و لہجہ کیسا ہوتا، اندازہ لگائیے، پھر دیکھئے کہ ان کی تمام ہمدردی و خیر خواہی کی دعوت کے جواب میں قوم نے کیا کہا:۔

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (اعراف)	"ہم تو آپ کو کھلی ہوئی گمراہی میں پاتے ہیں"

ادھر سے اللہ کے پیغمبر بجائے اس کے کہ اس سرکش قوم کی گمراہیوں، بدکاریوں کا پردہ چاک کرتے جواب میں کیا فرماتے ہیں:۔

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝	"میرے بھائیو! مجھ میں کوئی گمراہی نہیں میں تو رب العلمین کا رسول اور قاصد ہوں (تمہارے فائدہ کی باتیں بتلاتا ہوں)"

ان کے بعد آنے والے دوسرے اللہ کے رسول حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم نے معجزات دیکھنے کے باوجود از راہ عناد کہا کہ آپ نے اپنے دعوے پر کوئی دلیل پیش نہیں کی، اور ہم آپ کے کہنے سے اپنے معبودوں (بتوں) کو چھوڑنے والے نہیں، ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تم نے جو ہمارے معبودوں کی شان میں بے ادبی کی ہے، اس کی وجہ سے تم جنون میں مبتلا ہوگئے ہو

حضرت ہود علیہ السلام نے یہ سب کچھ سن کر جواب دیا:

إِنِّيٓ أُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوٓا أَنِّي بَرِيٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۝

"یعنی میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان بتوں سے بری اور بیزار ہوں جن کو تم اللہ کا شریک مانتے ہو (سورۃ ہود)

اور سورۃ اعراف میں ہے کہ ان کی قوم نے ان کو کہا:

إِنَّا لَنَرٰىكَ فِي سَفَاهَةٍ وَّإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِينَ

(اعراف)

"ہم تو آپ کو بیوقوفی میں مبتلا سمجھتے ہیں، اور ہمارا خیال یہ ہے کہ آپ جھوٹ بولنے والوں میں سے ہیں"

قوم کے اس دل آزار خطاب کے جواب میں اللہ کے رسول ہود علیہ السلام نہ ان پر کوئی فقرہ کستے ہیں، نہ ان کی بے راہی اور کذب و افتراء علی اللہ کی کوئی بات کہتے ہیں جواب کیا ہے صرف یہ کہ:

يٰقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّي رَسُولٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِينَ ۝

(اعراف)

"اے میری برادری کے لوگو مجھ میں کوئی بے وقوفی ذرا بھی نہیں، میں تو رب العٰلمین کا رسول ہوں"

حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کو حسب دستور انبیاء اللہ کی طرف دعوت دی اور ان میں جو بڑا عیب ناپ تول میں کمی کرنے کا تھا اس سے باز آنے کی ہدایت فرمائی، تو ان کی قوم نے تمسخر کیا، اور توہین آمیز خطاب کیا:

يٰشُعَيْبُ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ أَوْ أَنْ نَّفْعَلَ فِيٓ أَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ ۝

"اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں، اور یہ کہ جن اموال کے ہم مالک ہیں ان میں اپنی مرضی کے موافق جو چاہیں نہ کریں، واقعی آپ ہیں بڑے عقلمند دین پر چلنے والے"

انہوں نے ایک تو یہ طعنہ دیا کہ تم جو نماز پڑھتے ہو یہی تمہیں بے وقوفی کے کام سکھاتی ہے دوسرے یہ کہ مال ہمارے ہیں ان کی خرید و فروخت کے معاملات میں تمہارا یا خدا کا کیا دخل ہو، ہم جس طرح چاہیں ان میں تصرف کا حق رکھتے ہیں، تیسرا جملہ تمسخر و استہزاء کا یہ کہا کہ آپ ہیں بڑے عقلمند بہت دین پر چلنے والے۔

معلوم ہوا کہ یہ لادینی معاشیات کے پجاری صرف آج نہیں پیدا ہوئے ان کے بھی کچھ اسلاف ہیں جن کا نظریہ وہی تھا جو آج کے بعض نام کے مسلمان کہہ رہے ہیں، کہ ہم مسلمان ہیں اسلام کو مانتے ہیں، مگر معاشیات میں ہم سوشلزم کو اختیار کرتے ہیں، اس میں اسلام کا کیا دخل ہے، بہرحال اس ظالم قوم کے اس مسخرے پن اور دل آزار گفتگو کا جواب اللہ کا رسول کیا دیتا ہے، دیکھئے:

قَالَ يٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّي وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَمَآ أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلٰى مَآ أَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝

(سورۃ ہود، آیت ۸۸)

"اے میری قوم! بھلا یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھ کو اپنی طرف سے عمدہ دولت یعنی نبوت دی ہو تو پھر میں کیسے اس کی تبلیغ نہ کروں، اور میں خود بھی تو اس کے خلاف کوئی عمل نہیں کرتا جو تمہیں بتلاتا ہوں، میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک میری قدرت میں ہے اور مجھ کو جو کچھ اصلاح اور عمل کی توفیق ہو جاتی ہے وہ صرف اللہ ہی کی مدد سے ہے، میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں، اور تمام امور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجنے کے وقت جو نرم گفتار کی ہدایت منجانب اللہ دی گئی تھی اس کی پوری تعمیل کرنے کے باوجود فرعون کا خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تھا:

قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَّلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ۝ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ۝

(سورۃ شعراء)

"فرعون کہنے لگا (اچھا تم ہو) کیا ہم نے تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا، اور تم اس عمر میں برسوں ہمارے پاس رہا سہا کئے، اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قبطی کو قتل کیا تھا)، اور تم بڑے ناشکرے ہو"

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنا یہ احسان بھی جتلایا کہ بچپن میں ہم نے تجھے پالا ہے، پھر یہ احسان بھی جتلایا کہ بڑے ہونے کے بعد بھی کافی مدت تک تم ہمارے پاس رہے، پھر یہ عتاب کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے جو ایک قبطی بغیر ارادہ قتل کے مارا گیا تھا اس پر غصہ و ناراضی کا اظہار کر کے یہ بھی کہا کہ تم کافروں میں سے ہو گئے۔

یہاں کافروں میں سے ہونے کے لغوی معنی بھی ہو سکتے ہیں یعنی ناشکری کرنے والا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تو تم پر احسانات کئے اور تم نے ہمارے ایک آدمی کو مار ڈالا جو احسان کی ناشکری تھی، اور اصطلاحی معنی بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ فرعون خود خدائی کا دعویدار تھا، تو جو اس کی خدائی کا منکر ہوا وہ کافر ہوا۔

اب اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب سنئے، جو پیغمبرانہ آداب دعوت اور پیغمبرانہ اخلاق کا شاہکار ہے، کہ اس میں سب سے پہلے تو اس کمزوری اور کوتاہی کا اعتراف کر لیا جو اُن سے سرزد ہو گئی تھی، یعنی اسرائیلی آدمی سے لڑنے والے قبطی کو ہٹانے کے لئے ایک مکا اس کے مارا تھا جس سے وہ مر گیا، تو گو یہ قتل عمداً ارادۃً نہیں تھا، مگر کوئی دینی تقاضا بھی نہیں تھا، بلکہ شریعتِ موسوی کے لحاظ سے بھی وہ شخص قتل کا مستحق نہیں تھا، اس لئے پہلے یہ اعتراف فرمایا:-

فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ (سورۂ شعراء)	"یعنی میں نے یہ کام اُس وقت کیا تھا، جبکہ میں ناواقف تھا"

مراد یہ ہے کہ یہ فعل عطاءِ نبوت سے پہلے سرزد ہو گیا تھا جب کہ مجھے اس بارہ میں اللہ کا کوئی حکم معلوم نہیں تھا، اس کے بعد فرمایا:

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (سورۂ شعراء)	"پھر مجھ کو ڈر لگا تو میں تمہارے یہاں سے مفرور ہو گیا، پھر مجھ کو میرے رب نے دانشمندی عطا فرمائی، اور مجھ کو اپنے پیغمبروں میں شامل کر دیا"

پھر اس کے احسان جتلانے کا جواب یہ دیا کہ تمہارا یہ احسان جتانا صحیح نہیں، کیونکہ میری پرورش کا معاملہ تمہارے ہی ظلم و عدوان کا نتیجہ تھا، کہ تم نے اسرائیلی بچوں کے قتل کا حکم دے رکھا تھا، اس لئے والدہ نے مجبور ہو کر مجھے دریا میں ڈالا اور تمہارے گھر تک پہونچنے کی نوبت آئی، فرمایا:

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ	(رہا احسان جتلانا پرورش کا) سو یہ

عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (سورۂ شعراء)	وہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت میں ڈال رکھا تھا"

اس کے بعد فرعون نے جب سوال کیا وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، یعنی رب العالمین کون ہے اور کیا ہے؟ تو جواب میں فرمایا کہ وہ رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس سب کا، اس پر فرعون نے بطور استہزاء کے حاضرین سے کہا اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ، یعنی تم سن رہے ہو کہ یہ کیسی بے عقل کی باتیں کہہ رہے ہیں، اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا،

رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ	"یعنی تمہارا اور تمہارے باپ دادوں کا بھی وہی رب پروردگار ہے"

اس پر فرعون نے جھنجھلا کر کہا:

اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ	"یعنی یہ جو تمہاری طرف اللہ کے رسول ہونے کا مدعی ہے وہ دیوانہ ہے"

مجنون دیوانہ کا خطاب دینے پر بھی موسیٰ علیہ السلام بجائے اس کے کہ ان کا دیوانہ ہونا، اور اپنا عاقل ہونا ثابت کرتے اس طرف کوئی التفات ہی نہیں کیا، بلکہ اللہ رب العالمین کی ایک اور صفت بیان فرما دی:-

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ	"وہ رب ہے مشرق و مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تم کو کچھ عقل ہو"

یہ ایک طویل مکالمہ ہے جو فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہو رہا ہے، جو سورۂ شعراء کے تین رکوع میں بیان ہوا ہے، اللہ کے مقبول رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمہ کو اوّل سے آخر تک دیکھئے، نہ کہیں جذبات کا اظہار ہے نہ اس کی بدگوئی کا جواب ہے، نہ اس کی سخت کلامی کے جواب میں کوئی سخت کلمہ ہے، بلکہ مسلسل اللہ جل شانہٗ کی صفاتِ کمال کا بیان ہے، اور تبلیغ کا سلسلہ جاری ہے۔

یہ مختصر سا نمونہ ہے انبیاء علیہم السلام کے مجادلات کا جو اپنے معاند اور ضدی قوم کے مقابلہ میں کئے گئے ہیں، اور مجادلہ بالتی ہی احسن جو قرآن کی تعلیم ہے اس کی عملی تشریح ہے۔ مجادلات کے علاوہ دعوت و تبلیغ میں ہر مخاطب اور ہر موقع کے مناسب کلام کرنے میں حکیمانہ اصول اور عنوان و تعبیر میں حکمت و مصلحت کی رعایتیں بھی جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار فرمائی ہیں، اور دعوت الی اللہ کو مقبول و مؤثر اور پائیدار بنانے کے لئے جو طرز عمل

اختیار فرمایا ہے وہی دراصل دعوت کی رُوح ہے، اس کی تفصیلات تو تمام تعلیمات نبوی علیہ السلام میں پھیلی ہوئی ہیں، نمونے کے طور پر چند چیزیں دیکھئے:

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت میں اس کا بڑا لحاظ رہتا تھا کہ مخاطب پر بار نہ ہونے پائے، صحابۂ کرام جیسے عشاقِ رسول جن سے کسی وقت بھی اس کا احتمال نہ تھا کہ وہ آپ کی باتیں سننے سے اُکتا جائیں گے، اُن کے لئے بھی آپ کی عادت یہ تھی کہ وعظ و نصیحت روزانہ نہیں بلکہ ہفتہ کے بعض دنوں میں فرماتے تھے، تاکہ لوگوں کے کاروبار کا حرج اور ان کی طبیعت پر بار نہ ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہفتہ کے بعض ایام ہی میں وعظ فرماتے تھے تاکہ ہم اُکتا نہ جائیں، اور دوسروں کو بھی آپ کی طرف سے یہی ہدایت تھی۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا (صحیح بخاری، کتاب العلم)	"لوگوں پر آسانی کرو دشواری نہ پیدا کرو اور ان کو اللہ کی رحمت کی خوشخبری سناؤ، مایوس یا متنفر نہ کرو"

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تمہیں چاہئے کہ ربانی، حکماء، علماء اور فقہاء بنو، صحیح بخاری میں یہ قول نقل کرکے لفظ ربانی کی یہ تفسیر فرمائی کہ جو شخص دعوت و تبلیغ اور تعلیم میں تربیت کے اصول کو ملحوظ رکھ کر پہلے آسان آسان باتیں بتلائے، جب لوگ اس کے عادی ہوجائیں تو اس وقت دوسرے احکام بتلائے جو ابتدائی مرحلے میں مشکل ہوتے وہ عالمِ ربانی ہے، آجکل جو وعظ و تبلیغ کا اثر بہت کم ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عموماً اس کام کے کرنے والے ان اصول و آداب کی رعایت نہیں کرتے، لمبی تقریریں، وقت بے وقت نصیحت، مخاطب کے حالات کو معلوم کئے بغیر اس کو کسی کام پر مجبور کرنا ان کی عادت بن گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و اصلاح کے کام میں اس کا بھی بڑا اہتمام تھا کہ مخاطب کی جبکی یا رسوائی نہ ہو، اسی لئے جب کسی شخص کو دیکھتے کہ کسی غلط اور بُرے کام میں مبتلا ہے تو اس کو براہِ راست خطاب کرنے کے بجائے مجمع عام کو مخاطب کرکے فرماتے تھے

مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَفْعَلُوْنَ كَذَا	"لوگوں کو کیا ہوگیا کہ فلاں کام کرتے ہیں"

اس عام خطاب میں جس کو سنانا اصل مقصود ہوتا وہ بھی سن لیتا، اور دل میں شرمندہ

ہو کر اس کے چھوڑنے کی فکر میں لگ جاتا تھا۔

انبیاء علیہم السلام کی عام عادت یہی تھی کہ مخاطب کو شرمندگی سے بچاتے تھے، اسی لئے بعض اوقات جو کام مخاطب سے سرزد ہوا ہے اس کو اپنی طرف منسوب کرکے اصلاح کی کوشش فرماتے، سورۂ یٰسین میں ہے وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ، یعنی مجھے کیا ہوگیا کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت نہ کروں، ظاہر ہے کہ یہ قاصدِ رسول تو ہر وقت عبادت میں مشغول تھے، سنانا اس مخاطب کو تھا جو مشغولِ عبادت نہیں ہے، مگر اس کام کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔

اور دعوت کے معنی دوسرے کو اپنے پاس بلانا ہے، محض اس کے عیب بیان کرنا نہیں، اور یہ بُلانا اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ متکلم اور مخاطب میں کوئی اشتراک ہو، اسی لئے قرآن عزیز میں انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عنوان اکثر یٰقَوْمِ سے شروع ہوتا ہے، جس میں برادرانہ رشتہ کا اشتراک پہلے جتلا کر آگے اصلاحی کلام کیا جاتا ہے، کہ ہم تم تو ایک ہی برادری کے آدمی ہیں، کوئی منافرت نہیں ہونی چاہئے، یہ کہہ کر ان کی اصلاح کا کام شروع فرماتے ہیں۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت کا خط ہرقل شاہِ روم کے نام بھیجا، اس میں اوّل تو شاہِ روم کو "عظیم الروم" کے لقب سے یاد فرمایا، جس میں اس کا جائز اکرام ہے، کیونکہ اس میں اس کے عظیم ہونے کا اقرار بھی ہے، مگر رومیوں کے لئے اپنے لئے نہیں، اس کے بعد ایمان کی دعوت اس عنوان سے دی گئی:۔

يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ، (سورۂ آل عمران)	"اے اہلِ کتاب! اس کلمہ کی طرف جلدی سے آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے"

جس میں پہلے آپس کا ایک مشترک نقطۂ وحدت ذکر کیا کہ توحید کا عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، اس کے بعد عیسائیوں کی غلطی پر متنبہ فرمایا۔

تعلیماتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھیان دیا جائے تو ہر تعلیم و دعوت میں اسی طرح کے آداب و اصول ملیں گے، آجکل اوّل تو دعوت و اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی طرف دھیان ہی نہ رہا، اور جو اس میں مشغول بھی ہیں انھوں نے صرف بحث و مباحثہ اور مخالف پر الزام تراشی، فقرے کسنے اور اس کی تحقیر و توہین کرنے کو دعوت و تبلیغ سمجھ لیا ہے، جو خلافِ سنت ہونے کی وجہ سے کبھی مؤثر و مفید نہیں ہوتا، وہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم نے

اسلام کی بڑی خدمت کی، اور حقیقت میں وہ لوگوں کو متنفر کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

مروجہ مجادلات کی دینی اور دنیوی مضرتیں

آیت مذکورہ کی تفسیر میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصل مقصود شرع دعوت الی اللہ ہے، جس کے دو اصول ہیں، حکمت اور موعظت حسنہ، مجادلہ کی صورت کبھی سر آپڑے تو اس کے لئے بھی احسن کی قید لگا کر اجازت دیدی گئی ہے، مگر وہ حقیقۃً دعوت کا کوئی شعبہ نہیں، بلکہ اس کے منفی پہلو کی ایک تدبیر ہے جس میں قرآن کریم نے بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ کی قید لگا کر جس طرح یہ بتلادیا ہے کہ وہ نرمی، خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبے سے ہونا چاہئے اور اس میں دلائل واضحہ مخاطب کے مناسب حال بیان کرنا چاہئے مخاطب کی توہین و تحقیر سے کلّی اجتناب کرنا چاہئے، اسی طرح اس کے احسن ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود متکلم کے لئے مضرت نہ ہو جائے، کہ اس میں اخلاق رذیلہ حسد، بغض، تکبر، جاہ پسندی وغیرہ پیدا نہ ہو جائیں، جو باطنی گناہ کبیرہ ہیں، اور آجکل کے بحث و مباحثہ مناظرہ، مجادلہ میں شاذ و نادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ان سے نجات پائے تو ممکن ہے ورنہ عادۃً ان سے بچنا سخت دشوار ہے۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ جس طرح شراب اُمّ الخبائث ہے کہ خود بھی بڑا گناہ ہے اور دوسرے بڑے بڑے جسمانی گناہوں کا ذریعہ بھی ہے، اسی طرح بحث و مباحثہ میں جب مقصود مخاطب پر غلبہ پانا اور اپنا علمی تفوّق لوگوں پر ظاہر کرنا ہو جائے تو وہ بھی باطن کیلئے اُمّ الخبائث ہے، جس کے نتیجہ میں بہت سے روحانی جرائم پیدا ہوتے ہیں، مثلاً حسد، بغض، تکبر، غیبت، دوسرے کے عیوب کا تجسس، اس کی برائی سے خوش اور بھلائی سے رنجیدہ ہونا، قبولِ حق سے استکبار، دوسرے کے قول پر انصاف و اعتدال کے ساتھ غور کرنے کے بجائے جواب ہی کی فکر خواہ اس میں قرآن و سنت میں کیسی ہی تاویلات کرنا پڑیں۔

یہ تو وہ مہلکات ہیں جن میں باوقار علماء ہی مبتلا ہوتے ہیں، اور معاملہ جب ان کے متبعین میں پہونچتا ہے تو دست و گریبان اور جنگ و جدال کے معرکے گرم ہو جاتے ہیں، اِنّا للہ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا:-

"علم تو اہلِ علم و فضل کے مابین ایک رحم متصل (رشتۂ اخوت و برادری) ہے، تو وہ لوگ جنھوں نے علم ہی کو عداوت بنالیا ہے، وہ دوسروں کو اپنے مذہب کی اقتداء کی دعوت کس طرح دیتے ہیں، ان کے پیش نظر دوسرے پر غلبہ پانا ہی ہے تو پھر ان سے باہمی انس و مودت اور مروت کا تصور کیسے کیا کیا جاسکتا ہے، اور ایک انسان کے لئے اس سے بڑھ کر شر اور برائی اور

کیا ہوگی کہ وہ اس کو منافقین کے اخلاق میں مبتلا کردے، اور مؤمنین متقین کے اخلاق سے محروم کردے"۔

امام غزالیؒ نے فرمایا کہ علم دین اور دعوتِ حق میں اشتغال رکھنے والا یا تو اصولِ صحیحہ کے تابع اور مہلک خطرات سے مجتنب رہ کر سعادتِ ابدی حاصل کر لیتا ہے یا پھر اس مقام سے گرتا ہے تو شقاوتِ ابدی کی طرف جاتا ہے، اس کا درمیان میں رہنا بہت مستبعد ہے، کیونکہ جو علم نافع نہ ہو وہ عذاب ہی ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ عَالِمٌ لَّمْ یَنْفَعْهُ اللّٰهُ بِعِلْمِهٖ

"سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے دن وہ عالم ہوگا جس کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نفع نہ بخشا ہو"

ایک دوسری حدیث صحیح میں ہے:-

لَا تَتَعَلَّمُوا الْعِلْمَ لِتُبَاهُوْا بِهِ الْعُلَمَآءَ وَلِتُمَارُوْا بِهِ السُّفَهَآءَ وَلِتَصْرِفُوْا بِهٖ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَیْكُمْ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ فَهُوَ فِی النَّارِ (ابن ماجہ من حدیث جابر باسناد صحیح کذا فی الاحیاء)

"علم دین کو اس غرض سے نہ سیکھو کہ اس کے ذریعہ دوسرے علماء کے مقابلہ میں فخر و عزت حاصل کرو یا کم علم لوگوں سے جھگڑو کرو یا اس کے ذریعہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرلو اور جو ایسا کریگا وہ آگ میں ہے"

اسی لئے ائمہ فقہاء اور اہلِ حق کا مسلک اس معاملے میں یہ تھا کہ علمی مسائل میں جھگڑا اور جدال ہرگز جائز نہیں سمجھتے تھے، دعوتِ حق کے لئے اتنا کافی ہے کہ جس کو خطاء پر سمجھے اس کو نرمی اور خیر خواہی کے عنوان سے دلائل کے ساتھ اس کی خطاء پر متنبہ کردے، پھر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے، جھگڑے اور بدگوئی سے کلّی احتراز کرے، حضرت امام مالکؒ کا ارشاد ہے:-

كَانَ مَالِكٌ يَقُوْلُ الْمِرَآءُ وَالْجِدَالُ فِی الْعِلْمِ یَذْهَبُ بِنُوْرِ الْعِلْمِ عَنْ قَلْبِ الْعَبْدِ وَقِیْلَ لَهٗ رَجُلٌ لَّهٗ عِلْمٌ بِالسُّنَّةِ فَهَلْ یُجَادِلُ عَنْهَا قَالَ لَا وَلٰكِنْ یُّخْبِرُ بِالسُّنَّةِ فَاِنْ قُبِلَ مِنْهُ وَاِلَّا سَكَتَ (اوجز المسالک شرح موطا ص۱۲)

"امام مالکؒ نے فرمایا کہ علم میں جھگڑے اور جدال نورِ علم کو انسان کے قلب سے نکال دیتا ہے کسی نے عرض کیا کہ ایک شخص جس کو سنت کا علم ہو کیا وہ حفاظتِ سنت کیلئے جدال کرسکتا ہے، فرمایا نہیں، بلکہ اس کو چاہئے کہ مخاطب کو صحیح بات سے آگاہ کردے، پھر وہ قبول کرلے تو بہتر ورنہ سکوت اختیار کرے"

اس زمانے میں دعوت و اصلاح کا کام پوری طرح مؤثر نہ ہونے کے دو سبب ہیں۔

ایک تو یہ کہ فسادِ زمانہ اور حرام چیزوں کی کثرت کے سبب عام طور پر لوگوں کے قلوب سخت اور آخرت سے غافل ہوگئے ہیں، اور قبولِ حق کی توفیق کم ہوگئی ہے، اور بعض تو اس قہر میں مبتلا ہیں جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی کہ آخر زمانے میں بہت سے لوگوں کے قلوب اوندھے ہوجائیں گے، بھلے بُرے کی پہچان اور جائز و ناجائز کا امتیاز ان کے دل سے اُٹھ جائے گا۔

اور دوسرا سبب یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوتِ حق کے فرائض سے غفلت عام ہوگئی ہے، عوام کا تو کیا ذکر خواص علماء و صلحاء میں اس ضرورت کا احساس بہت کم ہے، یہ سمجھ لیا ہے کہ اپنے اعمال درست کرلئے جائیں تو یہ کافی ہے خواہ اُن کی اولاد، بیوی، بھائی، دوست احباب کیسے ہی گناہوں میں مبتلا رہیں ان کی اصلاح کی فکر گویا ان کے ذمہ ہی نہیں، حالانکہ قرآن و حدیث کی نصوص صریحہ ہر شخص کے ذمہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین کی اصلاح کو فرض قرار دے رہی ہیں قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا اور پھر اگر کچھ لوگ دعوت و اصلاح کے فریضہ کی طرف توجہ دیتے بھی ہیں تو وہ قرآنی تعلیمات اور دعوتِ پیغمبرانہ کے اصول و آداب سے ناآشنا ہیں، بے سوچے سمجھے جس کو جس وقت جو چاہا کہہ ڈالا، اور یہ سمجھ بیٹھے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کردیا ہے، حالانکہ یہ طرزِ عمل سنتِ انبیاء کے خلاف ہونے کی وجہ سے لوگوں کو دین اور احکامِ دین پر عمل کرنے سے اور زیادہ دور پھینک دیتا ہے۔

خصوصاً جہاں کسی دوسرے پر تنقید کی نوبت آئے تو تنقید کا نام لے کر تنقیص اور استہزاء و تمسخر تک پہونچ جاتے ہیں، حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا،

"جس شخص کو کسی غلطی پر متنبہ کرنا ہے، اگر تم نے اس کو تنہائی میں نرمی کے ساتھ سمجھایا تو یہ نصیحت ہے، اور اگر علانیہ لوگوں کے سامنے اس کو رسوا کیا تو یہ فضیحت ہے۔"

آجکل تو ایک دوسرے کے عیوب کو اخباروں، اشتہاروں کے ذریعے منظرِ عام پر لانے کو دین کی خدمت سمجھ لیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین اور اس کی دعوت کی صحیح بصیرت اور آداب کے مطابق اس کی خدمت کی توفیق عطا فرمائیں۔

یہاں تک دعوت کے اصول اور آداب کا بیان ہوا، اس کے بعد فرمایا،

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ، یہ جملہ داعیانِ دین کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا ہے، کیونکہ مذکور الصدر آدابِ دعوت کو استعمال کرنے کے باوجود جب مخاطب حق بات کو قبول نہ کرے تو طبعی طور پر انسان کو سخت صدمہ پہنچتا ہے، اور بعض اوقات اس کا یہ اثر بھی ہوسکتا ہے کہ دعوت کا فائدہ نہ دیکھ کر آدمی پر مایوسی طاری

۲۸

ہوجائے اور کام ہی چھوڑ بیٹھے، اس لئے اس جملے میں یہ فرمایا کہ آپ کا کام صرف دعوتِ حق کو اصول صحیحہ کے مطابق ادا کردینا ہے، آگے اس کو قبول کرنا یا نہ کرنا اس میں نہ آپ کا کوئی دخل ہے نہ آپکی ذمہ داری، وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، وہی جانتا ہے کہ کون گمراہ رہے گا، اور کون ہدایت پائے گا، آپ اس فکر میں نہ پڑیں، اپنا کام کرتے رہیں اس میں ہمت نہ ہاریں، مایوس نہ ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ جملہ بھی آدابِ دعوت ہی کا تکملہ ہے۔

داعی حق کو کوئی ایذاء پہونچائے تو بدلہ لینا بھی جائز ہے مگر صبر بہتر ہے

اس کے بعد کی تین آیتوں میں داعیانِ حق کے لئے ایک اور اہم ہدایت ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات ایسے سخت دل جاہلوں سے سابقہ پڑتا ہے کہ ان کو کتنی ہی نرمی اور خیر خواہی سے بات سمجھائی جائے وہ اس پر بھی مشتعل ہوجاتے ہیں، زبان درازی کرکے ایذاء پہونچاتے ہیں، اور بعض اوقات اس سے بھی تجاوز کرکے ان کو جسمانی تکلیف پہونچانے بلکہ قتل تک سے بھی گریز نہیں کرتے، ایسے حالات میں دعوتِ حق دینے والوں کو کیا کرنا چاہئے۔

اس کے لئے وَاِنْ عَاقَبْتُمْ الخ میں ایک تو ان حضرات کو قانونی حق دیا گیا کہ جو آپ پر ظلم کرے آپ کو بھی اس سے اپنا بدلہ لینا جائز ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ بدلہ لینے میں مقدارِ ظلم سے تجاوز نہ ہو، جتنا ظلم اس نے کیا ہے، اتنا ہی بدلہ لیا جائے اس میں زیادتی نہ ہونے پائے۔

اور آخر آیت میں مشورہ دیا کہ اگرچہ آپ کو انتقام لینے کا حق ہے لیکن صبر کریں اور انتقام نہ لیں تو یہ بہتر ہے۔

آیات مذکورہ کا شانِ نزول اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کی طرف سے تعمیلِ حکم

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ آیت مدنی ہے، غزوۂ احد میں ستر صحابہ کی شہادت اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کرکے مُثلہ کرنے کے واقعہ میں نازل ہوئی، صحیح بخاری کی روایت اسی کے مطابق ہے، دارقطنی نے بروایت ابن عباسؓ نقل کیا ہے کہ:

"غزوۂ احد میں جب مشرکین لوٹ گئے تو صحابۂ کرام میں سے ستر اکابر کی لاشیں سامنے آئیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہؓ بھی تھے چونکہ مشرکین کو اُن پر بڑا غیظ تھا، اس لئے ان کو قتل کرنے کے بعد اُن کی لاش پر اپنا غصہ اس طرح نکالا کہ ان کی ناک، کان، اور دوسرے اعضاء کاٹے گئے، پیٹ چاک کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منظر سے سخت صدمہ پہنچا، اور آپؐ نے فرمایا کہ میں حمزہؓ کے بدلے میں مشرکین کے ستر آدمیوں کا اسی طرح مُثلہ کروں گا، جیسا انھوں نے حمزہؓ کو کیا ہے، اس واقعہ میں یہ تین آیات

نازل ہوئیں، وَاِنْ عَاقَبْتُمْ الخ (تفسیر قرطبی) بعض روایات میں ہے کہ دوسرے حضرات صحابہ کے ساتھ بھی ان ظالموں نے اسی طرح کا معاملہ مُثلہ کرنے کا کیا تھا۔

(کما رواہ الترمذی واحمد وابن خزیمہ وابن حبان فی صحیحہا عن ابی بن کعبؓ)

اس میں چونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرطِ غم سے بلا لحاظ تعداد ان صحابہ کے بدلے میں ستر مشرکین کے مُثلہ کرنے کا عزم فرمایا تھا، جو اللہ کے نزدیک اس اصول عدل ومساوات کے مطابق نہ تھا جس کو آپؐ کے ذریعے دنیا میں قائم کرنا منظور تھا، اس لئے ایک تو اس پر متنبہ فرمایا گیا کہ بدلہ لینے کا حق تو ہے، مگر اسی مقدار اور پیمانہ پر جس مقدار کا ظلم ہے، بلا لحاظ تعداد چند کا بدلہ ستر سے لینا درست نہیں، دوسرے آپ کو مکارم اخلاق کا نمونہ بنانا مقصود تھا، اس لئے یہ نصیحت کی گئی کہ برابر سرابر بدلہ لینے کی اگرچہ اجازت ہے، مگر وہ بھی چھوڑ دو اور مجرموں پر احسان کرد تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

اس پر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہم صبر ہی کریں گے، کسی ایک سے بھی بدلہ نہیں لیں گے، اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا (مظہری عن البغوی) فتح مکہ کے موقع پر جب یہ تمام مشرکین مغلوب ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے قبضہ میں تھے، یہ موقع تھا کہ اپنا وہ عزم وارادہ پورا کر لیتے جو غزوۂ اُحد کے وقت کیا تھا، مگر آیات مذکورہ کے نزول کے وقت ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ارادے کو چھوڑ کر صبر کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لئے فتح مکہ کے وقت ان آیات کے مطابق صبر کا عمل اختیار کیا گیا، شاید اسی بناء پر بعض روایات میں یہ مذکور ہوا ہے کہ یہ آیتیں فتح مکہ کے وقت نازل ہوئی تھیں، اور یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ان آیات کا نزول مکرر ہوا ہو، اوّل غزوۂ اُحد میں نازل ہوئیں اور پھر فتح مکہ کے وقت دوبارہ نازل ہوئیں (کما حکاہ المظہری عن ابن الحصار)

مسئلہ: اس آیت نے بدلہ لینے میں مساوات کا قانون بتایا ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی کو قتل کر دے اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا، جو زخمی کر دے تو اتنا ہی زخم اس کرنے والے کو لگایا جائے گا جو کسی کا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے پھر قتل کر ڈالے تو ولیِ مقتول کو حق دیا جائے گا کہ وہ بھی پہلے قاتل کا ہاتھ یا پاؤں کاٹے پھر قتل کر دے۔

البتہ اگر کسی نے پتھر مار کر کسی کو قتل کیا یا تیروں سے زخمی کر کے قتل کیا تو اس میں نوعیتِ قتل کی صحیح مقدار متعین نہیں کی جا سکتی کہ کتنی ضربوں سے یہ قتل واقع ہوا ہے، اور مقتول کو کتنی تکلیف پہنچی ہے، اس معاملہ میں حقیقی مساوات کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، اس لئے اس کو تلوار ہی سے قتل کیا جائے گا (جصاص)

مسئلہ: آیت کا نزول اگرچہ جسمانی تکالیف اور جسمانی نقصان پہونچانے کے متعلق ہوا ہے مگر الفاظ عام ہیں جس میں مالی نقصان پہنچانا بھی داخل ہے، اسی لئے حضرات فقہاء نے فرمایا کہ جو شخص کسی کا مال غصب کرے تو اس کو بھی حق حاصل ہے کہ اپنے حق کے مطابق اس سے مال چھین لے، یا چوری کر کے لیسے بشرطیکہ جو مال لیا ہو وہ اپنے حق کی جنس سے ہو مثلاً نقد روپیہ لیا ہو تو اس کے بدلے میں اتنا ہی نقد روپیہ اس سے غصب یا چوری کے ذریعے لے سکتا ہے، غلہ، کپڑا وغیرہ لیا ہے تو اسی طرح کا غلہ، کپڑا لے سکتا ہے، مگر ایک جنس کے بدلے میں دوسری جنس نہیں لے سکتا، مثلاً روپے کے بدلے میں کپڑا یا کوئی دوسری استعمالی چیز زبردستی نہیں لے سکتا، اور بعض فقہاء نے مطلقاً اجازت دی ہے، خواہ جنسِ حق سے ہو یا کسی دوسری جنس سے، اس مسئلہ کی کچھ تفصیل قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے، اور تفصیل بحث کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔

آیت وَاِنْ عَاقَبْتُمْ میں عام قانون مذکور تھا جس میں سب مسلمانوں کے لئے برابر کا بدلہ لینا جائز مگر صبر کرنا افضل وبہتر بتلایا گیا ہے، اس کے بعد کی آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی خطاب فرما کر صبر کرنے کی تلقین وترغیب دی گئی ہے، کیونکہ آپؐ کی شانِ عظیم اور منصب بلند کے لئے دوسروں کی نسبت سے وہی زیادہ موزوں ومناسب ہے، اس لئے فرمایا وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ، یعنی آپؐ تو انتقام کا ارادہ ہی نہ کریں، صبر ہی کو اختیار کریں اور ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ آپؐ کا صبر اللہ ہی کی مدد سے ہوگا، یعنی صبر کرنا آپؐ کے لئے آسان کر دیا جائے گا۔

آخری آیت میں پھر ایک عام قاعدہ اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد حاصل ہونے کا یہ بتلا دیا:۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝

جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو دو صفتوں کے حامل ہوں، ایک تقویٰ دوسرے احسان، تقویٰ کا حاصل نیک عمل کرنا اور احسان کا مفہوم اس جگہ خلقِ خدا تعالیٰ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے، یعنی جو لوگ شریعت کے تابع اعمالِ صالحہ کے پابند ہوں اور دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرتے ہوں، حق تعالیٰ اُن کے ساتھ ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی معیت (نصرت) حاصل ہو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔

الحمد للہ سورۂ نحل کی تفسیر آج ۲۵ شعبان ۱۳۸۹ھ شب شنبہ میں پوری ہوئی۔

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا ۝

سورۂ نحل تمام شد